وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

ترجمہ:- جس نے اپنے رب کے (بلند و برتر) مقام سے خوف کیا اور (اپنے) نفس کو گری ہوئی خواہشوں سے روکا تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے +

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا میگزین

المنار

جون ۱۹۵۶ء — جلد ۵ شمارہ نمبر

نگران

پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم اے

— ترتیب دینے والے —

محمد اسلام بھٹی
آغا خالد سلیم
ناصر احمد پرویز
ایاز محمود احمد خان

اے۔ بی۔ آر حنیف ہاشمی ایڈیٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا

مندرجات

اداریہ ، ۳
جائزے ، ۴
شانِ تغزل ، پروفیسر نصیر احمد خان ، ۵
تبرکات ، احسان دانش ، ۶
غزل ، عبدالرشید تبسم ایم۔ اے ، ۷
غزل ، پرویز پروازی ، ۸
غزل ، افضل ترکی ، ۹
غزل ، محمد سعید اصغر ، ۱۰
نوائے درد ، خود شید جالندھری ، ۱۰
غزل ، محمد رشید اکبر ، ۱۱
تقدیر و تدبیر ، پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم اے ، ۱۲
ایک یاد ، ایک واقعہ ، ایک معجزہ ، ناصر احمد ناصر ، ۱۶
زہر اور زخم ، آغا شاہین ، ۱۸
دورِ جاہلیت میں عربوں کے علوم و فنون ، عطاء الکریم شاہد ، ۲۰
خواب یا حقیقت ، سلیم اختر صدیقی ، ۲۴
غزل ، منظور احمد شاکر ، ۲۷
تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے ، جمیل الرحمٰن ، ۲۸
ہمارا پڑوسی ، ایاز محمود احمد خان ، ۳۱
امّی کے نام خط ، کلیم اللہ کرشن ، ۳۴
پگڈنڈیاں ، ۳۷
تعزیت ، ۴۰

ادارتیہ

احساسِ فرض

دُنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کی بتدریج ترقی انسانوں کی مختلف اوقات میں مختلف کوششوں کی رہینِ منت رہی ہے۔ ہر زمانے کے مفکرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانوں کو ایک نئی ڈگر پر گامزن کر کے چند عقلی منزلوں کے سراغ دیئے اور پھر ان کے بعد آنے والے لوگوں نے ان خیالی منزلوں کو حقیقی منازل کے روپ میں بدل دیا اور پھر نئے لوگوں کو نئی راہیں اور نئے راستے دکھائے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ایک قوم اپنی انتہائی ترقی کے باوجود ایک منزل تک پہنچی۔ لیکن دوسری قوم نے اس منزل سے اپنی زندگی کی جدوجہد شروع کی جس منزل کو اس سے پہلی قوم نے انتہائی عروج کی منزل قرار دیا تھا۔

انسانی جدوجہد نے ہی آج ہمیں پتھر اور دھات کے زمانہ سے نکال کر ایٹم کے زمانہ میں لا کھڑا کیا ہے اور آج ہم اس زمانہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ غرض انسانی جدوجہد اور کوشش اور سعی کا یہ میٹھا پھل ہمارے سامنے ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

جس طرح انسانی ترقی، انسانی جدوجہد کی رہینِ منت ہے اسی طرح انسانی جدوجہد احساسِ فرض کی زیرِ بار ہے ـــــ اگر ہمارے آباء اپنے قلوب میں اس عظیم احساس کو پیدا نہ کرتے تو انسانیت کی ترقی ان کی جدوجہد کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تو آج ہم اسی فرسودہ نظام میں جکڑے ہوئے ہوتے۔

اس ترقی یافتہ دور میں جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمارے دل میں اور زیادہ ترقی کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غرض ہمارے دل اب بھی اس ترقی پر مطمئن نہیں ہیں اور ایک انجانی منزل کے لئے بیتاب ہیں ـــــ ہم اس مثالی (ideal) منزل کو اسی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے قلوب میں احساسِ فرض پیدا کریں۔ اگر ہمارے دلوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دُنیا کی کوئی طاقت ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور ہم بہت جلد دُنیا کو امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنا سکتے ہیں +

(پرویز پردانی)

جائزے

● ——— اس شمارے کی تدوین میں ہمیں کافی سے زیادہ تگ و دو کرنا پڑی ہے۔ کیونکہ مختلف قسم کی مشکلات راہ میں حائل تھیں۔ الحمدللہ کہ ان رکاوٹوں کے باوجود ہم اس شمارہ کو پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

———

● ——— حضرت احسان دانش کے دو اشعار ان کے اپنے خط میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس کے لئے جہاں ہم حضرت احسان کے احسان مند ہیں وہاں افضل ترکی صاحب کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے ہمیں یہ اشعار عنایت فرمائے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

———

● ——— جناب عبدالرشید صاحب تبسم ایم اے کی غزل شریکِ اشاعت ہے۔ آپ نے ہماری درخواست پر یہ غزل ارسال فرمائی ہے ہم ان کے مشکور ہیں۔

———

● ——— محترم پروفیسر نصیر احمد خان صاحب کی غزل کے متعلق کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں، تبصرہ سے بہت بالا ہے۔ کیونکہ محترم نصیر صاحب اپنی سند آپ ہیں۔

———

● ——— عطاء الکریم صاحب شاہد کا مقالہ "دورِ جاہلیت میں عربوں کے علوم و فنون" کافی خیال افروز ہے۔ اس مقالہ کی تیاری میں کتاب "تمدنِ عرب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ آپ نے عربی سوسائٹی میں پڑھا تھا۔ ہم اسے عربی سوسائٹی کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

———

● ——— سلیم اختر صدیقی صاحب "خواب یا حقیقت" کے عنوان سے ایک ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے جس محنت سے انگریزی کہانی کو اردو میں ڈھالا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ تراجم میں عموماً لوگ مصنف کے طرزِ نگارش کو قائم نہیں رکھ سکتے لیکن آپ نے ایک کہنہ مشق مترجم کی طرح مصنف کے اسلوب کو مدنظر رکھا ہے۔ امید ہے کہ اگر انہوں نے یہ مشق جاری رکھی تو وہ بہت اچھے مترجم ثابت ہوں گے۔ (باقی صفحہ پر)

پروفیسر نصیر احمد خان

شانِ تغزل

دل کی ان سے دوستی تھی میں نہ تھا — عشق کی دیوانگی تھی میں نہ تھا
جس نے پھونکا تھا فسونِ آرزو — شوق کی جادوگری تھی میں نہ تھا
جس نے کھائے تھے محبت کے فریب — میرے دل کی سادگی تھی میں نہ تھا
جس نے پھیلایا تھا دامِ آگہی — عقل کی دیوانگی تھی میں نہ تھا
رازِ الفت جس نے افشا کر دیا — میرے دل کی بے کلی تھی میں نہ تھا
جس نے پائی قبر میں تسکینِ دل — زیست کی درماندگی تھی میں نہ تھا
موت کو جس نے مسیحا کر دیا — درد کی دریا دلی تھی میں نہ تھا
اس طلسمِ رنگ و بو میں مدتوں — حسن کی جلوہ گری تھی میں نہ تھا
جس نے توڑا جسم و جاں کا رابطہ — موت کی غارتگری تھی میں نہ تھا
آب دی جس نے مرے اشعار کو — آگ اِک دل میں دبی تھی میں نہ تھا

رُک گئی تھی لب پہ جو آ کر نصیر!
اِک صدائے بے کسی تھی میں نہ تھا

تبرکات

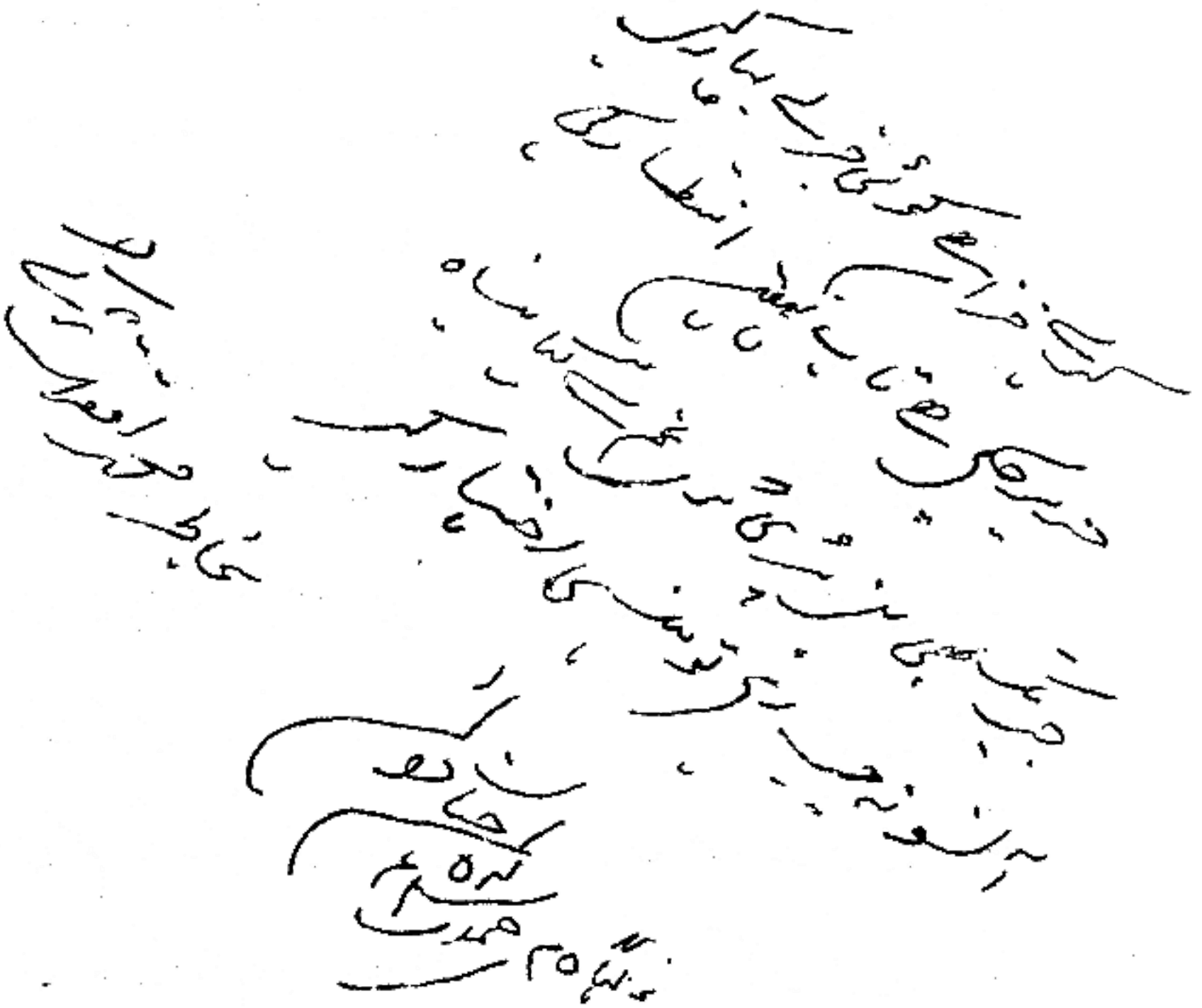

(بشکریہ افضل ترکی صاحب)

غزل

عبدالرشید تبسم ایم۔ اے

مرے در پہ امیدِ اجابت خود اُتر آیا
اُٹھا لے دستِ دُعا! شب ہو چکی وقتِ سحر آیا

اب اپنی قسمتوں کا دُو بدُو ہم فیصلہ کر لیں
خدا ہر مدعا سُننے کو گردوں سے اُتر آیا

جو باتیں رات کے پچھلے پہر خلوت میں کیں اس نے
انہیں اب مشتہر کرنے کا وقت اے نامہ بر آیا

یہ مصنوعی خدا غرقاب ہو کر پھر نہیں اُٹھتے
سفینہ بندگی کا ڈوب کے ہر بار اُبھر آیا

امیرِ کارواں! بجلی کی چشمک کیا غنیمت ہے
ظلامِ شب میں منزل کا نشاں مجھ کو نظر آیا

مرا مقصد جہانگیری نہیں افلاک گیری ہے
مرے تسخیر کے حلقے میں شمس آیا قمر آیا

گدائی کے عصا کو چوبِ شاہی سے بدلتا ہوں
کسی اہلِ نظر کے فیض سے مجھ کو ہنر آیا

ملے ہیں کاتبِ تقدیر سے ہم بعد مدت کے
زمیں کے وارثوں کو ڈھونڈنے وہ کل ادھر آیا

قیامت اس کا حیلہ تھا ہمیں دیدار دینے کا
سُنا جب صورِ اسرافیل تو میں دوڑ کر آیا

بجائے مشکبو ہم عاشقوں نے خونِ دل چھڑکا
وہ آیا بزم میں لیکن باندازِ دگر آیا

طمانچے موجِ دریا کے سہے برسوں تبسم نے
مقامِ گفتگو کیا ہے جو وہ بن کر گہر آیا

غزل

پرویز پروازی

خزاں رسیدہ بہاریں ستم رسیدہ چمن
عیاں ہے دشتِ جنوں میں قدم قدم پہ تھکن
کسے سنائیں کہ دنیا ہے عشرتوں کا فریب
کسے پکاریں کہ الفت کی منزلیں ہیں کٹھن
تمہاری زلف سے باقی ہے بوئے مشکِ ختن
تمہارے حسن سے زندہ بہارِ سرو و سمن
افق سے پھوٹی غموں کی بجھی بجھی سی کرن
کچھ اور بڑھ گئی زخمِ دل و جگر کی جلن

بچھا رہا ہوں تری رہ میں آنسوؤں کی بساط * پلا رہا ہوں جہاں کو مئے سرور و نشاط

افضل ترک

غزل

نہ نقش پا کے لئے ہے نہ سنگِ در کیلئے
مری جبیں ہے تماشا نظر نظر کیلئے

درِ قبول کہاں ہے کسی کو کیا معلوم؟
بھٹک رہی ہیں دعائیں ابھی اثر کیلئے

غمِ جہاں سے چھپانا بڑا ہی مشکل تھا
وہ ایک اشک جو لایا تھا چارہ گر کیلئے

نیا وطن ہے نئی منزلیں نئی راہیں
نئے چراغ جلاؤ نئے سفر کیلئے

مری نگاہ میں جچتے نہیں مہ و پروین
تری نگاہ مچلتی ہے سیم و زر کیلئے

دیارِ غیر میں کھاتا ہوں ٹھوکریں ترکی
کوئی وطن سے نہ آیا مری خبر کیلئے

محمد سعید اصغر

غزل

وہ زلفیں آج بکھرائے ہوئے ہیں
نوازش ہم پہ فرمائے ہوئے ہیں

مرے اشکوں کے یہ انمول موتی
فراقِ یار میں پائے ہوئے ہیں

تلاطم کا ہمیں کچھ غم نہیں ہے
فقط ساحل سے گھبرائے ہوئے ہیں

امیدیں ان جواں چہروں سے کیا جو
لڑکپن ہی میں مرجھائے ہوئے ہیں

حدودِ میکدہ میں آج اصغر
جنابِ شیخ بھی آئے ہوئے ہیں

خورشید جالندھری

نوائے درد

مایوس نگہِ یاس کو بکھیرا ہے چارسو
اُمید بجھ گئی ہے اندھیرا ہے چارسو

دستِ کرم سے مجھ کو سہارا تو دیجئے
تکلیف و اضطراب کا ڈیرا ہے چارسو

حسن کی بات عیاں ہوتی ہے
عشق کا درد نہاں ہوتا ہے

وہ اگر وقفِ طرب ہوتے ہیں
دل مرا وقفِ فغاں ہوتا ہے

محمد رشید اکبر

غزل

کچھ ہو تو کہوں میں دُنیا سے لو سُن لو مرا افسانۂ دل
کہتے ہیں مجھے دُنیا والے اس طور سے اب بیگانۂ دل

کہاں عیش و طرب کے دیوانے۔ کہاں عشق کے رنگیں افسانے؟
رہتا ہی نہیں کوئی ساقی یہاں خالی ہے مرا میخانۂ دل

ہمیں عشق سے لینا کیا آخر۔ ہمیں حسن سے ناطہ کا ہے کا؟
غم کھا کھا کے بھرپور ہوا۔ دُکھ درد سے ہے پیمانۂ دل

جو کچھ بھی بچانا چاہے ہے۔ جلدی سے بچالے اے ہمدم
اب شعلے بھڑکنے والے ہیں جل جانے کو ہے غم خانۂ دل

دل ہے یا مصیبت ہے کوئی ہر طرف اسی کا رونا ہے
جو دیکھو اسی کے تابع ہے۔ جو ملتا ہے دیوانۂ دل

ہر طرف اداسی چھائی ہے۔ ہر سمت خموشی طاری ہے
کوئی آئے یہاں پر کا ہے کو ویراں ہے بہت ویرانۂ دل

اِس دُنیا کی ہے ریت یہی کس بات کی ہم فریاد کریں
ہر پھول کھلا مُرجھانے کو۔ جلنے کو بنا پروانۂ دل

پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔ اے

تقدیر و تدبیر

تقدیر کے مسئلہ پر بہت پرانے زمانے سے فلاسفر بحثیں کرتے چلے آئے ہیں لیکن کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ مسلمانوں میں بھی علماء نے اس سلسلے میں گرما گرم مباحث کئے ہیں۔ عموماً اس کا نتیجہ یہ نکلتا رہا کہ یا تو لوگ افراط کی طرف مائل ہو گئے یا تفریط کی طرف۔ اور درمیانی سنہری راستہ اختیار نہ کیا گیا۔

عموماً ان دو لفظوں کو یعنی تقدیر و تدبیر کو ایک دوسرے کا متقابل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ متقابل نہیں۔ بلکہ ان دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے لازمی طور پر جڑا ہوا ہے۔

تدبیر کے معنے ہیں کوشش کرنا اور یہ عموماً بندے کی طرف سے ہوتی ہے۔ تقدیر کے معنے اندازہ کرنا یعنی انسانی کوششوں کا ایک خاص قانون اور اندازے کے موافق نتیجہ نکالنا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

انسان بسا اوقات ایک تدبیر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلنا چاہیئے لیکن وہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ قسمت میں یونہی لکھا تھا اور تدبیر بے فائدہ چیز ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ نتیجہ انسان کی اس وقتی کوشش کے علاوہ اور بہت سے مؤثرات کے اثر کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمام مؤثرات کا مجموعی نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ لیکن بندے کے سامنے صرف اس کی وقتی کوشش ہوتی ہے۔ اس لئے بظاہر اُسے بعض اوقات تقدیر یعنی خدائی فیصلے اور نتیجے میں اور تدبیر یعنی انسانی کوشش میں تضاد نظر آتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بعض قوانین اور اندازوں کے موافق اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجراء اور اس کے نتیجہ کو تقدیر کہا جاتا ہے۔ ان صفات کو حرکت میں لانے کی کوشش کو تدبیر کہا جاتا ہے۔ اور یہ تمام امور دائمی قوانین اور اصولوں پر مبنی ہیں۔

بعض اوقات انسانی تدبیر ایک معین نتیجہ کو چاہتی ہے لیکن اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی بعض دوسری صفات جوش میں آئی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات انسانی تدبیر پر غالب آجاتی ہیں اور نتیجہ انسانی تدابیر کے اُلٹ نکلتا ہے۔ اس قسم کی تقدیر کو تقدیر خاص کہا جاتا ہے۔

عام تقدیر تو یہی ہے کہ انسانی تدابیر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کوئی طبعی نتیجہ مرتب کرے۔ اور اسی تقدیر عام پر تمام کارخانۂ قدرت اور انسانی اعمال کا دارومدار ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص روٹی پکانے کے لئے

اُسے توے پر رکھتا ہے تو خدائی قانون کے ماتحت وہ روٹی پک جاتی ہے۔ اگر خدا کی یہ عام تقدیر (جسے دوسرے لفظوں میں خدائی قانون کا نام دیا جا سکتا ہے) نہ ہوتی تو انسان کبھی روٹی توے پر ڈالتا تو وہ پگھل جاتی کبھی ڈالتا تو وہ بخارات بن کر اُڑ جاتی۔ پس تمام دُنیا کے کاموں کا عام طور پر دارومدار خدا تعالیٰ کی تقدیر عام پر ہے۔

ایک صحابی جو طاعون زدہ علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے اُن پر اعتراض کیا گیا کہ :۔

اَتَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ ۔ کیا تو خدائی تقدیر سے بھاگتا ہے ۔ تو اس کا یہی جواب دیا گیا کہ

نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ ۔

کہ ہم ایک تقدیر سے (جو بُرا نتیجہ پیدا کرنے والی ہو) بھاگ کر خدا کی ایک دوسری تقدیر یا ایک دوسرے خدائی قانون کی پناہ لیتے ہیں ۔

مثلاً یہ خدا کی تقدیر یا اندازہ یا قانون ہے کہ طاعون زدہ علاقے میں ہر انسان عموماً طاعون کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کی تقدیر کو تقدیر شر کہتے ہیں ۔ اس کے مقابل پر یہ بھی خدائی قانون ہے کہ جو شخص طاعون کے جراثیم کو اپنے سے دُور رکھے وہ طاعون سے بچایا جائے ۔ یہ خدا کی تقدیر خیر ہے ۔

پس انسان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر خیر و تقدیر شر دونوں کا علم رکھے اور اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے ۔

ایمان کے اجزاء میں سے یہ امر بھی ہے کہ ہم خدا کی تقدیر خیر و شر پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان لانے کا مطلب یہی ہے کہ ہم ان دونوں تقدیروں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں ۔

ہاں جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا ہے ۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے خاص فیصلے اس کی عام تقادیر یا قوانین پر غالب آجایا کرتے ہیں ۔ مثلاً عام قانون یہ ہے کہ قلت کثرت کے مقابلے میں ہار جایا کرتی ہے ۔ کثرت قلت کو کھا جاتی ہے ۔

لیکن انبیاء کے ساتھ ایمان لانے والے تھوڑے ہوتے ہیں مگر ہمیشہ انبیاء کا گروہ ہی غالب آتا رہا ہے اور مخالف شکست کھاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے دائمی فیصلے تقدیر خاص کا رنگ اختیار کر کے اس کے عام قوانین پر غالب آجاتے ہیں ۔ مثلاً یہی کہ

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (قرآن کریم)

خدا نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب آیا کریں گے ۔

پھر فرمایا :۔

اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ

یقیناً خدا کا گروہ ہی غالب رہے گا ۔

یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی تدبیر ہی خدائی تقدیر کو کھینچنے والی ہے ۔ تدبیر جو صحیح راستے پر چل کر کی جائے وہ ضرور صحیح نتیجہ پیدا کرتی ہے ۔ ہاں بعض اوقات انسانی تدابیر خدا تعالیٰ کی خاص تقدیروں سے ٹکرا جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ ناکام رہ جاتی ہیں ۔

حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا طریق یہی ہے کہ

انسان تدبیر سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی تقدیر عام کو اپنے قبضے میں کرے لیکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض مخفی فیصلے اور بعض دوسرے ایسے مؤثرات و محرکات جن کا انسان کو علم نہیں اس تدبیر کو ناکام بنا دیں ہوں اس کے لئے خدا تعالیٰ نے دُعا کا طریق رائج کیا ہے۔ دُعا کے ذریعہ انسان مخفی محرکات و مؤثرات کے شر سے بچ جاتا ہے۔ دُعا کے ذریعہ سے انسان خدا کی تقدیر خاص کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تو کی صفات کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ جب بندہ عاجزی اور خلوصِ نیت سے خدا تعالیٰ کو پکارتا ہے تو اس کی صفاتِ رحمت حرکت میں آتی ہیں۔

پس اپنی تدبیر کے علاوہ یعنی خدا تعالیٰ کے عام قانون اور تقدیر کو قبضے میں کرنے کے علاوہ جب بندہ ساتھ دُعا بھی کرتا ہے تو پھر اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ اور یہی وہ گُر ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں سکھایا ہے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

نَعْبُدُ کے معنے ہیں کہ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم تیرے عبد بن جائیں گے۔ یعنی ہم ایسی تدابیر اختیار کریں گے جن کے ذریعہ سے ہم تیری صفات کا رنگ اپنے اُوپر وارد کر لیں۔ لیکن ہماری کوششوں میں بعض ایسی مخفی خامیاں رہ سکتی ہیں جن کا ہمیں علم نہ ہو اور اُن خامیوں کے نتیجہ میں ہماری تدابیر کالعدم ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح تیری بعض دوسری تقدیریں ہمارے راستے میں روک بن سکتی ہیں صحیح تدبیر کرنے کی توفیق بھی ہمیں تیری جناب سے ہی میسر آ سکتی ہے۔ اس لئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تجھ سے ہی استعانت چاہتے ہیں اور مطلب کہتے ہیں ہو سکتا ہے ہم نیکی اختیار کریں لیکن اندر ہی اندر تکبر اور خود پسندی کے جراثیم ہمارے اندر نشوونما پکڑ کر ہمیں تباہ کر ڈالیں۔ پس اے خدا! ہماری تدبیریں تبھی کامیاب ہو سکتی ہیں جبکہ تیرا آخری فیصلہ بھی ہمارے حق میں ہو اور تمام مضرات کے اثر کو تو زائل کر دے۔

بعض اوقات انسان کے آگے ایسے مراحل بھی پیش آتے ہیں کہ انسانی تدبیر کو اُن میں کچھ بھی دخل نہیں ہوتا وہاں خدا کی تقدیر خاص تنگی ہو کر انسان کے سامنے آتی ہے اور صرف دُعا کے ذریعہ سے ہی انسان اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کو جذب کرتے ہوئے کامیابی کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دُعا خود ایک لطیف رُوحانی تدبیر ہے جو خدائی تقدیروں کو انسان کے موافق بنا دیتی ہے ؎

غیر ممکن کو یہ ممکن سے بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زورِ دُعا دیکھو تو

یہ امر ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ تقدیر خاص گو بندے کی تضرعات کے نتیجہ میں آتی ہے لیکن آتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے۔ کسی بندے کا یہ حق نہیں کہ وہ بطور دعوے کے کہے کہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انبیاء سے بھی جب خوارق و معجزات دکھلانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ یہی کہتے ہیں:-

اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ (قرآن کریم)

معجزات خدا کے پاس ہی ہیں۔ خدا تعالیٰ جب چاہتا ہے یعنی جب اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے تو وہ خوارق و معجزات دکھلاتا ہے۔ عام طور پر خدائی تقدیر عام ہی جاری رہتی ہے۔ تقدیر عام کے نتائج بھی دعا کے ذریعہ سے ہی ظاہری و باطنی طور پر تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

پس تدبیر کو چھوڑ کر صرف دعا پر انحصار رکھنا بھی خدائی قوانین سے مذاق کرنے کے مترادف ہے جلم حالت میں دعا کبھی بھی تدبیر کا قائم مقام نہیں ہوتی وہ اس پر سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ ہاں جہاں انسانی تدابیر کا خاتمہ ہو وہاں دعا بھی ایک عظیم الشان لطیف روحانی تدبیر بن جاتی ہے۔

تمام انبیاء رعایت اسباب و تدابیر سے کام لیتے رہے ہیں پس کون ہے وہ جو انبیاء سے بڑا ہونے کا مدعی ہو اور سمجھتا ہو کہ میرے لئے خدا تعالیٰ کا یہ قانون اور رنگ میں ظاہر ہونا چاہیئے۔

دعا کے سلسلے میں ایک اور ضروری امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نہاں در نہاں حکمتوں کی وجہ سے ہماری دعا کسی خاص تقدیر الٰہی کا اجراء نہ کرا سکے تو پھر بھی وہ رائیگاں نہیں جاتی۔ بلکہ کئی اور بُری تقدیروں کے ازالہ کا موجب بن جاتی ہے اور دعا کرنے والے ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں بامراد ہی ہوتے ہیں۔

تجھے دُنیا میں کس نے ہے پکارا
کہ پھر خالی گیا قسمت کا مارا (مسیح موعود)

ہمارا پڑوسی ... بقیہ صـ۳۳

رکھیئے۔"

فرمانے لگے ——— "ابھی میری تسلی نہیں ہوتی جب تک سوٹ نہ آجائے اگر آپ ہی تکلیف کریں تو ——— !"

میں نے کہا ——— "اچھا کام تو ایک ضروری تھا۔ مگر چھوڑتا ہوں اب۔"

چائے کی طرف ہاتھ بڑھا کر فرمانے لگے ———

"چھوڑیئے صاحب اس سے بڑھ کر اور ضروری کام کونسا ہو گا۔ جانتے نہیں میرا تو گھر میں داخل ہونا مشکل ہے" بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کالج کی راہ لی!

امی کے نام ——— بقیہ صـ۳

مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ میں بلا تکلف دے دیتا ہوں۔ کوئی کتاب تو دوسرے تیسرے روز مل جاتی ہے۔ اور بعض حضرات تو کتابیں واپس کرنا ہی بھول جاتے ہیں۔ اس دریا دلی کی بدولت میری بیشتر کتابیں رخصت ہو چکی ہیں اور باقی، وہ رخصت ہونے کی فکر میں ہیں ——— آپ فکر نہ کریں میں سعادتمند اور سلیم بچہ ہوں۔ لٹ جاؤں گا مگر اُف نہ کرونگا۔

ہاں امی! ایک بات کہے دیتا ہوں، ابا اس خط کو ہرگز نہ دیکھنے پائیں۔ ورنہ آپ سے لڑائی ٹھہرے گی ——— ننھی صبو کو سلام، ابا کو پیار
(معاف کیجئے اُلٹا پڑھ لیں)

آپ کا ننھا
کلیم اللہ خان کرشن سال دوم

ناصر احمد ناصر سال چہارم

ایک یاد، ایک واقعہ، ایک معجزہ

ہمارے ایک بزرگ حضرت مصلح موعود کے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ جوانی کے دنوں میں حضور کے ساتھ کھیلے اور انہوں نے اپنے کانوں سے حضور کی باتوں کو سنا اور اپنی آنکھوں سے آپ کے معجزات دیکھے ہیں۔

حضرت مصلح موعود جب کبھی بھیرو چھچی جایا کرتے تو چوہدری صاحب کو ضرور اطلاع کر دیتے۔ جناب چوہدری صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک دفعہ حسب معمول حضور شکار کھیلنے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ چنانچہ حضور کے آنے سے ایک دن قبل میں اپنی دونالی بندوق اور کچھ کارتوس لے کر گھر سے اس نیت سے نکلا کہ کل حضور کی آمد پر کچھ نہ کچھ تو ہوں تاکہ عین وقت پر کوئی دقت پیش نہ آئے۔ میں دریا کی طرف شکار کے لئے چلا گیا۔ شام ہو گئی لیکن حضور کے لئے ابھی تک کوئی عمدہ شکار ہاتھ نہ لگا۔ حضور عموماً ککھ پسند فرمایا کرتے تھے۔ میں نے دریا کے کنارے کے قریب ہی ایک تالاب میں کچھ مرغابیاں دیکھیں اور فائر کر دیا۔ لیکن کچھ نہ ملا۔ فائر کے دھماکہ سے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے پانی کے ذخیروں میں سے جانور اڑتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے بندوق کندھے پر رکھی اور واپسی کا ارادہ کیا کہ اچانک میرے سر کے اوپر سے دو ککھ تھوڑی سی بلندی پر اڑتے ہوئے گزرے۔ میں نے جلدی سے بغیر نشانہ باندھے یونہی اندازے سے ہی دوسرا فائر کیا۔ ان میں سے ایک ککھ زخمی ہو کر دریا میں گر پڑا لیکن آفتاب غروب ہو چکا تھا، تاریکی چھا رہی تھی اور شام کے جھٹ پٹے میں دریا میں ککھ کی تلاش بالکل ناممکن تھا۔ دوسرے پہاڑ کی جانب بادل گرج رہا تھا۔ گاہے گاہے بجلی کی چمک سے ہر طرف روشنی پھیل جاتی۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ صبح آ کر ماہی گیر کی کشتی لے کر ککھ کی تلاش کروں گا۔ زخمی جانور آخر جائے گا تو کہاں؟ انہی خیالات میں الجھے ہوئے میں نے گھر کی راہ لی گھر پہنچا، عشاء کی نماز پڑھی، کھانا وغیرہ کھایا اور سو گیا۔ تھکاوٹ کی بنا پر ایسی نیند آئی کہ صبح آنکھ کھلی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد جلدی جلدی ناشتہ وغیرہ کیا اور اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد جلد ہی محمد علی اور دو تین اور شکاریوں کے ہمراہ دریا کی طرف شکار کی تلاش میں چل دیا۔

جب ہم دریا پر پہنچے تو کوئی چڑی نہ سنسار شکار کا نام و نشان نہ تھا۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے مرغابی اور مچھلی سب کچھ غائب تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کل والے [illegible] زخمی مگھ کا ذکر کیا اور کہا کہ دیکھو تو سہی شاید کہیں نظر آ جائے۔ ہر طرف دیکھا مگر بے سود۔ اچانک میری نظر دریا پار ایک جھاڑی پہ پڑی تو مگھ نظر آ گیا۔ میں نے کہا۔ محمد علی! مگھ تو ہے لیکن ہے دریا کے دوسرے کنارے پر۔ وہ دیکھو جھاڑی میں چھپا بیٹھا ہے۔ محمد علی نے ذرا آگے بڑھ کر خود دیکھا اور بے اختیار آواز بلند یہ پکارا:۔

"ہُن تے پیراں دا ہو گیا ایں ہُن تے
آ جا"

(اب تو پیروں کے ہو گئے ہو اب تو آ جاؤ)

جونہی محمد علی نے یہ الفاظ ادا کئے مگھ اپنی جگہ سے نکلا اور سیدھا تیرتا ہوا ہماری جانب بڑھنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاں پر ہم کھڑے تھے وہاں پر آ گیا اور کنگھاٹی پر چڑھنے لگا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے استدعا کی کہ ذرا پیچھے ہٹ جائیں کہیں یہ ڈر نہ جائے۔ محمد علی بجائے پیچھے ہٹنے کے جلدی سے آگے بڑھا اور مگھ کو پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ مگھ کا دایاں بازو زخمی ہے جس کے باعث وہ اُڑ نہیں سکتا تھا۔ میں اسی طرح وہ مگھ حضور کے پاس لے گیا۔

جب میں زندہ مگھ حضور کے پاس لے گیا تو آپ ذرا حیران سے ہوئے اور پوچھا کہ فضل احمد یہ زندہ مگھ کس طرح پکڑا؟ اس پر میں نے سارا اگھ کہہ سنایا۔

اس پر حضور نے مجھے بعینہٖ اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا جو میں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم دریا میں کشتی پر سیر کر رہے تھے۔ میر صاحب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں میر صاحب نے کہا ...... "سنا ہے کہ پانی پر خواجہ خضر خواج کی حکومت ہے اور تمام سمندر، دریا اور ندیاں وغیرہ ان کے تابع ہیں۔ حضور خواجہ خضر خواج سے کہیں کہ ہمیں مچھلی تو کھلائے۔"

حضور فرماتے ہیں کہ ابھی میں نے جواب بھی نہ دیا تھا کہ ایک بڑی مچھلی شاید کسی مگرمچھ سے ڈر کر یا کسی اور بلا سے ڈر کر اچھلی اور ہمارے پاؤں کے پاس آ کر گری۔ میں نے میر صاحب سے کہا کہ "لیجئے میر صاحب خواجہ خضر خواج نے ہمارے لئے مچھلی بھیج دی۔"

وہ مچھلی نہایت ہی اعلیٰ قسم کی مچھلی تھی جس کا وزن تقریباً چار سیر تھا کشتی پر ہی ہم نے اسے پکوایا اور کھایا ...."

یہ ہیں وہ زندہ معجزات جن سے خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے۔

ایک سیٹھ صاحب کو راستے میں کسی ڈاکو نے لوٹ لیا۔ ان کے کسی دوست نے ان سے پوچھا کہ سیٹھ صاحب! آپ تو ہر وقت اپنے پاس پستول رکھتے تھے۔ کیا جب ڈاکو نے لوٹا تو آپکے پاس پستول نہیں تھا؟ سیٹھ صاحب نے بڑی شیخی سے جواب دیا۔ ہاں تھا! لیکن میں نے بڑی چالاکی سے اسے پاجامہ میں چھپا کر بچا لیا۔

آغا شاھین

زہر اور زخم

ایک تمثیلی افسانہ

سورج ڈھل چکا تھا اور اندھیرے نے ہر چیز پر اپنا دامن پھیلا دیا تھا۔ اور ایک ہیبتناک قسم کا اندھیرا میری روح کے ایوانوں میں بھی پھیلتا جا رہا تھا.....

.... ہزاروں پریشان کن سوالات پُراسرار پہاڑوں کی طرح میرے گرد کھڑے تھے اور ان سے ٹکرا کر میری پیشانی زخمی ہو گئی تھی۔ میرا ایمان نیم مردہ حالت میں سسک رہا تھا اور ہزاروں گدیں میرے ایمان کے سسکتے جسم کو کھا جانے کے لئے میرے ذہن کے افق پر منڈلا رہی تھیں۔ میں دونوں ہاتھ پتلون میں ڈالے کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح ایک نئی راہ پر جا رہا تھا۔ میں اس راہ سے بھٹک گیا تھا جو شہد اور دودھ کی نہروں پر ختم ہوتی ہے۔ اور ایک ایسی راہ پر ہو لیا تھا جو یاس و حسرت کے گرم گرم اور پیاسے صحراؤں میں جا کر ختم ہو رہی تھی۔ اور اس راہ کے دونوں کناروں پر پریشان کن سوالوں کے پُراسرار پہاڑ کھڑے تھے۔ اور اب ان پہاڑوں سے ٹکرانے کی مجھ میں طاقت باقی نہ رہی تھی..... چلتے چلتے میں غیر ارادی طور پر ایک پہاڑ سے ٹکرا ہی گیا

"یہ مذہب کیا ہے.......؟"

"ایک خوبصورت دھوکا......!" جیسے میری روح کے ایوانوں میں پھیلے ہوئے اندھیرے نے چیخ کر کہا۔

"لیکن......"

"لیکن کیا..... تم نہیں جانتے کہ آج سے لاکھوں سال قبل جب کہ انسان انسان نہ تھا تب اسے جو بھی چیز اپنے آپ سے معلوم ہوئی اس نے اسے خدا جانکر سجدہ کیا اور پھر ان میں سے ایک ہوشیار انسان نے انسانوں کو محض انسان بنانے کی غرض سے مذہب کا ڈھونگ رچایا..... اور چونکہ دُنیا کی ہر چیز ارتقا کی منزلیں طے کرتی ایک غیر معیّن حد کی طرف بھاگی جا رہی ہے اسلئے مذہب کو بھی ان ارتقائی منازل سے گزرنا پڑا۔ اور ایک مذہب کی جگہ دوسرے نے لی۔ اور اس طرح مذہب لاتعداد خداؤں سے ارتقا کر کے تین خداؤں کی منزل پر پہنچ گیا اور پھر ایک ایسا مذہب بھی آیا جس نے بتایا کہ خدا ایک ہے اور اب قدرت کا یہی تقاضا ہے کہ اس ایک خدا والے مذہب کے بعد ایک ایسا مذہب بھی آئے جس میں کوئی خدا نہ ہو۔ اور پھر چاہے اسے مذہب کہا جائے یا کچھ اور.......؟"

میں نے پریشان ہو کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ میں حقیقت کے اس گرم جھکڑ سے اپنے ایمان کے شگوفوں کو جلانا نہیں چاہتا تھا..... میرا دماغ تھک چکا تھا اور دماغ کی تھکاوٹ نے میرے سارے جسم پر تھکاوٹ انڈیل دی تھی۔ میں نے

اپنی تھکی ہوئی پلکوں پر جلتے والے امید کے دھندوں کی روشنی میں اپنے گرد پھیلے ہوئے اندھیرے میں دیکھا۔ مجھے دُور ایک پہاڑ سا نظر آیا۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اُس کے نزدیک گیا اور سستانے کے لئے وہاں بیٹھ گیا۔۔۔

۔۔۔ میں پریشان حال بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اپنے بالکل نزدیک کسی بزرگ ہستی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا میرے پیچھے مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک برگزیدہ انسان میری طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے گرد کتابیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے سے ایک آسمانی قسم کا نور اُبل رہا تھا جو اُن کے گرد پھیلی ہوئی کتابوں کو منور کر رہا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کچھ پریشان سے معلوم ہو رہے ہو۔۔۔؟"

"جی۔۔۔۔ جی ہاں جناب میں بہت ہی پریشان ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں تم کیوں پریشان ہو۔ آجکل جبکہ مولویوں اور دوسرے مذہب کے ٹھیکیداروں نے مذہب کو چند ناممکن چیزوں کا مجموعہ بنایا ہوا ہے تب انسانی ذہن اِن مجموعہ کے گرد طواف کر کے تھک جاتا ہے اور اسکے ایمان کی پھلواڑی میں کھلے ہوئے پھول جل جاتے ہیں تب وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ یہی پریشانی اسے اسکے عقیدوں سے باغی بنا دیتی ہے۔ آج جبکہ دنیا اپنے عقیدوں سے بغاوت کر کے دہریت کی طرف جا رہی ہے اور مذہب کے ٹھیکیدار پریشان ہیں تب میں بہت خوش ہوں کیونکہ دنیا اندھے عقیدوں سے بغاوت کر کے دہریت کی طرف نہیں بلکہ عقل کی طرف آرہی ہے اور اب وہی مذہب کامیاب ہوگا جو عقل پہ مبنی ہو۔۔۔!"

"لیکن جناب میرے خیال میں تو ہر مذہب چند ناممکن چیزوں کا نام ہے" میں نے پوچھا۔

"درحقیقت حقیقت اُسوقت ہی حقیقت ٹھہرتی ہے جب اسے پہچانا جائے۔ گو وہ اپنے مقام پر زندہ رہتی ہے لیکن وہ اس انسان کے لئے مُردہ ہو چکی ہوتی ہے جو اُسے جان نہیں سکتا۔ اگر تم حقیقت کو پہچانتے ہوتے تو آج یہ نہ کہتے کہ ہر مذہب چند بے بُنیاد باتوں کا نام ہے۔۔۔"

اور پھر انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ انکی باتیں جم کر موٹی موٹی کتابوں کا روپ اختیار کر لیتی تھیں اور میں نے جب اُن کتابوں کو سینے سے لگایا تب میری روح کے ایوانوں میں دھوپ میں نہائی ہوئی صبح چمک اٹھی۔ میرے ایمان کی لاش اُن جاناں کے کفن کو پھاڑ کر زندہ ہو گئی۔ میری روح وحشتناک گھاس سے چھپی ہوئی دلدل سے نکل آئی۔ میں اس بزرگ ہستی کا بیحد ممنون تھا۔ میں نے عقیدت میں ڈوب کے پوچھا۔

"جناب! میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟"

وہ آہستہ سے پیچھے مڑے انکے ایک ہاتھ میں پیالہ تھا اور دوسرا ہاتھ انہوں نے اپنی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ اور کہا۔

"نوجوان! قبل از مسیح جب میں ایتھنز میں آیا تھا تو تم لوگوں نے مجھے زہر دی تھی اور آج جب بعد از مسیح میں یہاں آیا ہوں تو تم لوگوں نے مجھے میری شہ رگ پر چاقو سے زخم دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔!"

عطاء الکریم شاہد

دورِ جاہلیت میں عربوں کے علوم و فنون

خوشحالی عوام کو کثرتِ علم اور ترقی یافتہ تمدن کی طرف گامزن کرتی ہے۔ کسی قوم کے افراد جس قدر معاشی الجھنوں سے محفوظ ہوں گے اسی قدر وہ اپنا وقت علوم فنون کے مطالعہ میں گزار سکیں گے۔ علوم و فنون کا گہوارہ شہر اور آباد جگہیں ہوتی ہیں کیونکہ یہاں صنعتوں کی کثرت ہوتی ہے اور علم کے حاصل کرنے میں ہر ممکن آسانی مہیا ہو سکتی ہے جو ایک دیہاتی اور گاؤں میں بسنے والے کو میسر نہیں۔

عرب بدو تھے اسلئے دورِ جاہلیت میں صرف ان علوم کی ترویج ممکن تھی جن کا سادگی تقاضا کرتی تھی۔ عربوں کا زیادہ وقت تلاشِ معاش اور صحرا گردی میں گزر جاتا تھا۔ وہ اس ماحول میں رہتے ہوئے علم طبیعیات، کیمیا، حشرات و نباتات کے متعلق کس طرح سوچ سکتے تھے؟ آب و گیاہ کی تلاش میں وہ منزل بمنزل چلتے، جہاں تھکتے ڈیرے ڈال دیتے، رات گزارتے پھر آگے چل پڑتے۔ چونکہ انہیں سفر سے اکثر واسطہ رہتا تھا اسلئے انہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ستاروں کے متعلق واقفیت ضرور تھی۔

جنگ و جدال کے سیاہ بادل عرب پر چھائے رہتے تھے۔ ضروری تھا کہ وہ اپنے قبائل کو جمع کرنے کے لئے علم الانساب میں دسترس رکھتے۔ چنانچہ عرب اسکے ماہر تھے۔ ان کے ذرائع نقل و حرکت میں گھوڑوں اور اونٹوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ جہاں انہیں طبِ انسانی کی ضرورت تھی وہاں وہ طبِ حیوانی کے متعلق بھی معلومات رکھتے تھے۔ صحرا میں وہ قدرت کے مناظر کو اپنے اصلی روپ میں دیکھتے اور پھر اپنے خیالات کا اظہار شعر و نثر کے اسی علم سے کرتے جو قدرت نے انہیں ودیعت کیا تھا۔ وہ حسین الفاظ اور فصیح و بلیغ زبان میں ان دلکش مناظر کا نقشہ کھینچتے۔ فنِ شعر سے عربوں کو فطری لگاؤ تھا۔ اور یہ فن ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔

علوم جاہلیت

دورِ جاہلیت کے علوم کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ علوم ماوراء الطبیعہ۔ جس میں کہانت، عرافت، تعبیر الرؤیا اور رمل وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ علوم طبیعہ۔ جس میں طب، بیطاری اور علم الانواء شامل ہیں۔

۳۔ علوم عربیہ۔ جس میں لغت، امثال، انساب،

اخبار اور خطابت شمار کئے جا سکتے ہیں۔

۴۔ علوم ریاضی جس میں علم نجوم اور علم الاصنام داخل ہیں۔

ا۔ علوم ماوراء الطبیعہ۔

(۱) کہانت و عرافت سے مراد اطلاع علی الغیب لی جاتی تھی۔ کاہن کبھی تو عہد ماضی کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا اور گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کرتا اور کبھی مستقبل کے حالات و واقعات سے مطلع کرتا۔ مشرک کاہن کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اس کی ذات میں وہ تمام صفات یکجا موجود تھیں۔ جو علیحدہ علیحدہ فلسفی، حکیم اور پیشوا میں پائی جا سکتی ہیں۔ کاہن مریضوں کا تعویذوں وغیرہ سے علاج کیا کرتے تھے۔ اصحاب دولت ان سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔

عربوں نے یہ علم کلدانیوں سے سیکھا جو بذات خود عرب تھے۔

(۲) تعبیر الرؤیا۔ خوابوں کی تعبیر بتانا بھی انکے ہاں ایک مستقل علم سمجھا جاتا تھا۔ ابن ابی قحافہ اور ابوبکر تعبیر الرؤیا میں کمال دسترس رکھتے تھے۔

ب۔ علوم طبیعہ۔

(۱) علم طب و بیطاری۔ علم طب اور بیطاری میں عرب بہت ماہر تھے۔ اسی دور میں طبیب اور حکیم دو وجود نہ ہوا کرتے تھے بلکہ کاہن ہی مفرد ادویات اور تعویذوں سے علاج کیا کرتا تھا۔ عمل جراحی بھی ناقص صورت میں موجود تھا۔ اونٹ اور گھوڑے اس زمانے عربوں کی متاع عزیز ہوا کرتے تھے اسلئے وہ ان کے علاج وغیرہ کے طریقوں سے بھی پوری طرح واقف تھے۔

(۲) علم موسمیات۔ موسمیات کے متعلق عربوں کا علم عقلی نہ تھا۔ مثلاً موسموں کے تغیر و تبدل کو وہ ستاروں کے طلوع اور تاثیر کا نتیجہ بتاتے۔ بحری سفر کے وقت منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ہواؤں کا رُخ جاننا لازمی ہوتا تھا اسلئے وہ مختلف ہواؤں کے رُخ سے بھی واقف تھے۔

ج۔ علوم عربیہ۔

(۱) علم لغت۔ عربی سامی زبانوں میں سب سے زیادہ کہن سال ہے۔ عرب ہمیشہ ہی اسے بولتے رہے ہیں لیکن مختلف قبائل کے لب و لہجہ میں خاصا فرق تھا۔ اور اس فرق کی وجہ مقامی اور تمدنی حالات تھے۔ قریش کی زبان اس وقت شستہ تسلیم کی جاتی تھی۔ عربی سے مراد قریش کی زبان ہی ہوتی ہے۔ علم لغت بھی یہی ہے۔ اس کی تدوین اس دور ظلمت میں نہیں ہوئی۔ دور عباسیہ میں علم اللغت ایک مستقل فن کی حیثیت پا گیا۔ لیکن اس کا ماخذ اسی عہد کی نظم و نثر ہے۔ ادبا الفاظ اور محاورات کے استعمال کے جواز میں اسی دور کے شعراء کے

اشعار اور خطبات کی عبارت پیش کرتے ہیں۔
(۳) امثال۔ امثال عربوں کی سیاسی، تمدنی، معاشی اور مذہبی زندگی کی غمازی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ادب میں انہیں بہت اہمیت حاصل ہے ایجاز اور اختصار پر عربوں کو ہمیشہ قدرت رہی ہے۔ وہ موعظت اور حکمت کی باتوں کو اس عمدگی کے ساتھ بیان کرتے کہ تحریر و تقریر جامع اور فصیح نظر آنے لگتی۔ امثال ہمارا بہت بڑا تاریخی ماخذ بھی ہیں۔ کیونکہ ان میں بہت کم ردو بدل کیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ بعد زمانہ کے ساتھ ساتھ انکی ادبی اور تاریخی حیثیت بھی گر چکی ہے۔ کیونکہ ایک تو اسلوب بیان نمایاں طور پر بدل چکا ہے اور دوسرے یہ کہ امثال اپنی وضاحت بالکل نہیں کرتیں یا بہت کم کرتی ہیں۔
(۴) علم الانساب۔ اس علم کو عربوں نے جنم دیا اور عرب اس پر بجا طور پر فخر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی قوت حافظہ کی وجہ سے اقوام عالم میں منفرد تھے اور انہیں علم الانساب بھی اسی قدرت کے ساتھ عطا کیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شرافت پاکیزگی اخلاق و عادات، عزت نفس، جود و سخا اور بخشش و عطا سب موروثی ہیں۔ لئیم باپ کا بیٹا مروت اور نیکی سے ہمیشہ نا آشنا رہتا ہے اسی طرح بہادر اور فنون حرب میں ماہر باپ کا بیٹا موروثی طور پر شجاع و دلیر ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ اپنے قبائل کو رشتۂ وحدت میں منسلک کرنے کیلئے بھی اس علم کے محتاج تھے ماہرین علم الانساب اپنے ساتھ ایک دو اور آدمیوں کو رکھ لیتے اور انہیں اپنا علم ودیعت کر دیتے۔
نور اسلام کے ظہور کے بعد نسب پرستی کا بت پاش پاش کر دیا گیا اور دنیا کو اس وحدت اسلامی کا نمونہ پیش کیا کہ اسکی نظیر مشکل ہی نہیں ناممکن ہے دنیا نے اس حقیقت کا اسوقت بھی مشاہدہ کیا جبکہ حضرت امیر المومنین فاروق اعظمؓ کا جنازہ پڑھا جا رہا تھا تو بلا حسب و نسب ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیبؓ رومی امام۔
(۴) خطابت جس طرح شاعری سے عربوں کو فطری لگاؤ تھا۔ اسی طرح نثر پر بھی وہ قدرت رکھتے تھے۔ اگر ہر قبیلے میں شاعر کا وجود لازمی تھا تو خطیب کا ہونا بھی ضروری تھا لیکن خطابت ثانوی درجہ رکھتی تھی۔ اگر نثر ناقابل تردید حقائق پر مشتمل ہو اور عمدہ ترین پیرایہ میں بیان کیگئی ہو تو اسکے اثر سے انکار سے کس طرح ممکن ہے؟ دور جاہلیت کی نثر کے بہت کم نمونے ہم کو ملے ہیں کیونکہ نثر بمقابلہ نظم حافظہ میں دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خطبات کا بیشتر حصہ تلف ہو چکا ہے۔ عربوں کو اس زمانہ میں خطابت کی دو مواقع پر خصوصاً ضرورت پیش آیا کرتی تھی۔ جب وہ غنیم کے خلاف اپنے قبیلہ کو جنگ کیلئے اکساتے اور جب کوئی سفیر کسی بادشاہ یا سردار کے دربار میں جاتا تو وہ فن خطابت سے ہی دوسروں کو متاثر کر سکتے تھے۔

اس زمانہ کے مشہور خطیب :-
کعب بن لوی۔ سحبان بن وائل۔ خویلد بن عمرو
اور اکثم بن صیفی تھے۔

ظہور اسلام کے بعد شاعری کو ثانوی درجہ
دیا گیا اور خطباء کی قدر و منزلت بہت بڑھ
گئی۔ رشد و ہدایت اور اجتماع قوم کیلئے
خطبہ ہی ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔

(۵) علم الاخبار ــــ عربوں کو اپنے
اسلاف کے کارنامے ازبر یاد تھے جن
کا ذکر اشعار میں بکثرت موجود ہے۔
ان کی تاریخی معلومات سطحی نوعیت کی
تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی
ذریت کو مکہ میں آباد کرنا خانہ کعبہ کی تعمیر
اور حرب الفجار وغیرہ کے موضوعات انہیں
خوب یاد تھے۔ واضح رہے کہ ان واقعات
پر جو ان میں معروف تھے آثار کہن سالی
نمایاں ہو چکے تھے۔ کیونکہ یہ روایات
سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی
جاتی تھیں۔ اور بُعد زمانہ کے ساتھ ساتھ
یہ محض خرافات بن چکی تھیں حقیقت
اور اصلیت کو ان سے دُور کا بھی واسطہ
نہ تھا۔

د۔ علوم ریاضیہ :-

(۱) علم نجوم - عربوں کو قحط سے بچنے کیلئے
جہاں بارش اور ہواؤں کے متعلق
واقفیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ جہاں
صحیح راستوں پر گامزن ہونے کے لئے
ستاروں کا علم جاننا بھی ضروری تھا
اس میں ستاروں کا طلوع و غروب
ان کے رنگ و اقسام، اکیلے
اور اکٹھے ستاروں کی صورتیں اور
جو کچھ ان سے مترتب ہوتا ہے شامل
تھا۔ عربوں کا یہ فن کلدانیوں کا مرہون
منت ہے۔ لیکن عرصہ دراز کے مشاہدات
اور تجربات کے بعد وہ خود بھی علم
نجوم میں کمال حاصل کر چکے تھے۔
بنو حارثہ بن کلب اور بنو مرہ
بن ہمام الشیبانی اس فن میں ید طولیٰ
رکھتے تھے۔

(۲) ماہ و سال کا حساب۔ عرب ماہ و سال کے حساب
سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے مہینوں کے نام بھی
مختلف طریق سے یاد کر رکھے تھے۔

(بشکریہ عربی سوسائٹی)

ایک سنگ تراش نے ایک نہایت اعلیٰ مسجد کا
چھوٹا سا ماڈل تیار کیا اور ایک فوٹوگرافر سے کہا کہ
اس کا فوٹو کھینچ دو۔ میں نے اپنے بیٹے کو بھجوانا ہے۔
فوٹوگرافر نے اسی وقت ماڈل کو سامنے رکھ کر
کیمرے کو فٹ کیا اور یہ کہہ کر "Ready please
ہلنا نہیں - آنکھ نہیں جھپکنی" کیمرے کا بٹن دبا دیا۔

سلیم اختر صدیقی

خواب یا حقیقت

ٹیسٹ صاحب اپنی بیٹھک میں آتشدان کے پاس کھڑے تھے۔ ان کا لڑکا جیمی کچھ اداس اور کچھ مایوس ان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی ماں آگ کے پاس بیٹھی تھی۔ جیمی امتحان میں فیل ہوگیا تھا۔ اس کا باپ اُسے یاد دلا رہا تھا کہ وہ پچھلی بار بھی صرف لاپرواہی کی وجہ سے فیل ہوا تھا ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی اور پھر وہ کند ذہن بھی نہیں بلکہ جو کچھ پڑھتا تھا اسے خوب یاد رہتا تھا۔

"سراسر لاپروائی تھی" اس کے باپ نے یقین کے ساتھ کہا۔

"جیمی! کیا تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش نہیں ہے؟"

"میں ..... کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کچھ کرکے دکھاؤں گا" جیمی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"کیا؟ خاک؟" اس کے باپ نے پوچھا۔

جیمی خاموش رہا۔

"بولو جیمی، بولتے کیوں نہیں" باپ نے پھر کہا

"بولو جیمی" اس کی ماں نے بھی کہا۔

کوئی موزوں جواب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن پھر بھی نہ معلوم اس کی ماں کی آواز میں کیا چیز تھی جس نے اس کی خاموشی توڑ دی۔

اس نے کہا "امی! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں نے دُنیا کو بچایا ہے ـــــ اور یہ محض خواب نہیں ہوگا۔"

"خواب؟" اس کے باپ نے تلخی سے کہا۔

"تمہیں زندہ رہنا ہے ـــــ خوابوں کی دُنیا میں نہیں عملی دُنیا میں ـــــ"

"جمی! مجھے اپنا خواب سُناؤ۔"

لیکن اس کے باپ کے غیر ہمدردانہ الفاظ نے اس کے خواب کو اس کے ہونٹوں پر منجمد کر دیا۔

"کام یا خواب؟" اس کا باپ اپنی بات دُہراتا رہا۔ "الفرڈ کو دیکھو اس کو ہرگز وہ سہولتیں میسّر نہ تھیں جو تم کو ہیں۔ وہ تمہارے ہی سکول میں پڑھا اور کیا اس کی وہ ایجاد تمہارے سامنے نہیں جس کو اس نے اپنے نام رجسٹری کرا لیا ہے۔ تم نے بھی کچھ کیا ہوتا لیکن ہر جگہ تمہاری لاپروائی ـــــ تمہارے دادا سرکاری نوکر تھے۔ میں بھی ساری زندگی یہاں کے سب سے اچھے بینک میں کلرک رہا اور تم ـــــ؟ تم کو اگر کوئی کام مل سکے گا تو وہ ڈرائیوری ہی ہوگا۔" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ جیمی کی طرف سے شرمندگی کا

اظہار متوقع ہو لیکن ادھر گہری خاموشی تھی۔
"ہاں" اس نے اپنی بات جاری رکھی "میں جب تمہاری ہی عمر کا تھا ایک جان پہچان کا بس ڈرائیور مجھے بھی یہاں ملتا اور سلام کرتا تھا اور اب باوجود اس کے کہ تم پہ اتنی رقم خرچ کی گئی تم کچھ نہیں کر سکے۔ تمہارے سامنے اس سے بہتر مستقبل نہیں ہے۔ شاید ساری عمر کے لئے تمہیں بس ڈرائیور ہی بننا ہو۔ غم کی وجہ سے جمی کے چہرے پر نیلاہٹیں ابھر آئیں۔ لندن کی گلیوں میں بس چلانا بہت لوگوں کی خواہش ہوتی ہے۔ یہی خواہش جمی کی بھی تھی۔ لیکن اس وقت اس خواہش کو پورا ہوتا دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنا نامناسب تھا اسلئے وہ چپ رہا۔

جمی بس ڈرائیور بن گیا۔

لیکن یہ جمی ٹیبٹ کی کہانی نہیں ہے۔ یہ تو اختراعی صلاحیتوں کے مالک الفارڈ کی داستان ہے یہ وہی الفارڈ تھا جس کا تذکرہ جمی کے باپ نے کیا تھا اور جس نے زندگی کی جد وجہد جمی ہی کے معیار سے اس کے ساتھ ہی شروع کی تھی۔ لیکن اب اُسس سے ہر اعتبار سے آگے تھا۔

یہ الفارڈ کے تفکرات کی کہانی ہے۔

وہ لندن کی سڑک پر جا رہا تھا۔ سینکڑوں آدمی اس کے پاس سے گزرتے۔ کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔ الفارڈ اپنی کثیر ایجادات کے متعلق سوچنے لگا جن پر کندہ کیا ہوا اس کا نام بہت سے لوگوں کے لئے بے معنی اور فضول تھا۔ اس نے ایک اور چیز دریافت کی تھی اور اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے اسے یہ سوچنے میں لطف ملتا تھا کہ وہ مجمع میں جائے اور لوگ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر گزرتے چلے جائیں۔ کیونکہ وہ اس کی عظمت کو نہیں پہچانتے۔

گو اس کی ایجاد ابھی تک کاغذ پر منتقل نہیں ہوئی تھی لیکن فکر کی تمام منازل طے کر چکی تھی۔ یہ ایک بم تھا جس کے کچھ اجزاء گزشتہ لوگ ایجاد کر چکے تھے اور کچھ ایٹم بم کے مرہونِ منت تھے۔ یہ ناگاساکی اور ہیروشیما کو برباد کرنے والے بموں سے زیادہ تباہ کن تھا۔

اس کا یہ فارمولا صرف کاغذ ہی پر منتقل کرنا باقی تھا اور پھر انسان کے ہاتھ میں ایک اور ہتھیار ہوگا جس کو وہ بہت جلد استعمال کریگا۔ یہ استعمال کرنیوالا کون ہوگا؟ —— اس کی الفارڈ کو زیادہ فکر نہ تھی اس کو صرف سائنس اور اپنے اس کام کا خیال تھا جس کو اس نے بخوبی پورا کیا تھا۔ اس دن صبح کو وہ اپنی کامیابی کے خیال سے اتنا شادماں و فرحاں تھا کہ یہ سوچنے میں لطف محسوس کر رہا تھا کہ وہ ان گنت لوگوں کی بھیڑ میں سے گزر رہا ہے۔ لیکن مجمع میں سے اسے کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس سے واقف نہیں۔ تاہم وہ ان کے دشمنوں کی زندگی ختم کر سکتا ہے' وہ سوچنے لگا کہ یہ طاقت کسی ہاتھ میں بھی جا سکتی ہے' دوست کے بھی اور دشمن کے بھی —— اور پھر کوئی شہر اسکے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔ دنیا بھر میں کوئی مکان اپنی جگہ

قائم نہیں رہ سکتا۔

اس خیال نے اسے ایسا فخریہ احساس بخشا جو اب تک کسی شہنشاہ کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ تیمور لنگ، چنگیز خان، ہٹلر اور بہت سے ایسے لوگ اس طاقت کے پیچھے ساری دنیا میں سرگرداں رہے۔ یہی طاقت جس کا وہ مالک ہے بڑے بڑے شہنشاہ جس کے ناکام متلاشی تھے یہ کسی دیوانے کا خواب نہ تھا بلکہ اس کا ایجاد کردہ بم شرطیہ اپنا کام کر سکتا تھا۔ وہ سائنس میں اناڑی نہ تھا..... لوگ اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کوئی اس طرف نہیں دیکھتا تھا۔ کوئی بھی اس کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کوئی اسے دنیا میں کبھی طاقت کا مالک نہ سمجھتا تھا.... کوئی بات نہیں... .....وہ ان کی لاپرواہی برداشت کر سکتا ہے۔ اس سے اس کا کیا بگڑتا ہے۔ سارے شہر اس طرح برباد ہو جائیں گے کہ ان کی پھر سے تعمیر نہیں ہو سکے گی یہ سب کیوں ہوگا ——؟ اس کی وجہ.... صرف اس کی وجہ سے ...... ! کون ہے جس کے پاس ایسی طاقت ہے —— ؟ کس دماغ نے اس سے پہلے ایسے مقصد کا عزم کیا تھا۔ شاعری اور ادب کے میدان میں انسانی دماغ کے حاصل کی عظمت سے وہ منکر نہیں لیکن اس کی عظیم ایجاد کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

ہاں —— وہ ابھی گھر جا کر اپنے فارمولوں کو قلمبند کرے گا لیکن اپنا یہ راز ساری عمر اپنے سینہ میں محفوظ رکھے گا۔ اس کے افشا کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے سوائے نقصان کے۔ کیونکہ جیسے ہی یہ بم استعمال کیا جائے گا وہ بھی سب کے ساتھ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مختصر سی شہرت اور بس —— ! اس کے معاوضہ میں صرف ذرا سا نام۔ —— ! نہیں نہیں وہ زندہ رہنا چاہتا ہے، وہ زندہ رہ کر اپنے دوسرے کاموں میں بھی شہرت حاصل کرے گا۔ لیکن کچھ بھی ہو —— اس کو اسی خیال سے تسلی تھی کہ ساری دنیا —— ہاں پوری دنیا اسکی عظیم الشان ایجاد کی گرفت میں ہے۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوگا تو اپنی اس خون انگیز دریافت کو شائع کر دیگا...... اور تب اس کے مرنے کے بعد دنیا بھی موت کی سرحدیں چھولیگی —— اور جب پھر بساطِ عالم بچھائی جائے گی تو وہ دنیا اس دنیا سے کتنی مختلف ہوگی۔ اس کی وجہ سے یہ دنیا اور چاند دونوں بدل جائیں گے —— ہاں وہ چاند کی سرزمین پر بھی اثر انداز ہوگا۔ یہ ایک مضطرب خیال تھا اور وہ اپنی فکر میں غرق عاجزی وہ انکسار سے نہیں، بلکہ خون انگیز منصوبوں کے وزن سے سر جھکائے ہوئے ...... انجانے اور ناواقف لوگوں کی بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے اس نے گلی یاد کی ...... اور پھر چاند کے متعلق سوچنے لگا —— ایسی طاقت جسکے سامنے سب آتش فشاں پہاڑ ہیچ ہیں ایک عظیم طاقت کا مالک .... وہ ...... الفارڈ آرفوالڈ۔ ..... اس طاقت کا تنہا واحد مالک ——!! یکایک —— اس وقت بھی اپنی بس میں اسکے

سامنے آگیا . . . . . دونوں طرف لاپرواہی قسمت
کے قبضہ میں تھی ۔ الفارڈ اپنے منصوبوں میں مگن اور
جمی اپنی سوچ میں غرق ـــــ اور جمی نے واقعی
دُنیا کو بچا لیا ۔ ایک ہولناک تباہی ۔ اور . . .
ایک لرزہ خیز بربادی سے ـــــ اس کا خواب
سچا تھا ـــــ بالکل سچا ـــــ (انگریزی کہانی کا آزاد ترجمہ)

غزل ـــــ منظور احمد شاکر

وفاؤں کو بُھلایا جا رہا ہے
ہمیں بسمل بنایا جا رہا ہے

ہوائیں سسکیاں سی لے رہی ہیں
کسی کا گھر لُٹایا جا رہا ہے

ہمیں در در پھرایا جا رہا ہے
محبت کو ستایا جا رہا ہے

یہ مژدہ ہو دلِ ناداں تمہیں آج
سُوئے مقتل بُلایا جا رہا ہے

الٰہی خیر میری زندگی کی !
مجھے دَر سے اٹھایا جا رہا ہے

جمیل الرحمٰن

تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے

(ایک خط جو ڈاک کی نذر ہونے کی بجائے ایڈیٹر صاحب کی نذر ہو گیا)

ربوہ
۱۵ ۵/۵۶

اچھے شمیم!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

بے انتہا انتظار کیا، پر آپ کا خط نہ آیا۔ عید آئی اور گزر گئی ——— بے کیف عید ———

اپنی کالج کے وقت کی پرانی رف کاپی نکال کر ورق گردانی کر رہا تھا۔ تقریباً ہر صفحہ پر آپ کا پیارا نام لکھا تھا ——— دو تین مرتبہ پھر میں نے کاغذ پر لکھا "شمیم" ——— پھر انگریزی میں بھی لکھا ——— پھر یونہی ایک سپید صفحہ پر نام لکھنے شروع کر دیئے جن کا پہلا حرف انگریزی حروف تہجی کی ترتیب سے تھا۔ ——— صرف اس لئے کہ جب "ایس" (S) کی باری آئے گی تو لکھوں گا "Shameem" ——— پھر جب لکھتے لکھتے 'J' کی باری آئی تو میں نے لکھا 'Jamal'۔ اور جب 'S' پر پہنچا تو ابھی پہلے کالم میں جگہ تھی لیکن میں نے دوسرا کالم شروع کر دیا۔ اور سب کے اوپر نسبتاً جلی حروف میں "Shameem" لکھا ——— سوائے 'x' کے ساتھ شروع ہونے والے نام کے باقی تمام نام میں لکھ چکا تھا ——— پھر میں نے 'x' کی جگہ پر کرنے کے لکھ دیا "se" کی "xex" ——— اگلا سپید صفحہ میرے قلم کے نیچے تھا میں نے لکھا:

اس کی گلی سے آئے کیوں
نکہتِ زلف لائے کیوں

یہ شعر الف سے شروع ہوا تھا۔ آج خلاف معمول طبیعت کی عجیب افتاد تھی۔ پھر 'ب' کے شعر کی باری تھی اور 'پ'، 'ت' وغیرہ ———

میں کاغذ پر یہ شعر لکھ چکا تھا:

بادِ شمیم آئی، خوشیاں سمیٹ لائی
مستی و شادمانی ہر ایک دل پہ چھائی

کیا اچھا شعر ہے "بادِ شمیم آئی" .....

پندرہ دن گزر چکے تھے لیکن آپ کا خط نہ آیا۔ خدا معلوم آپ کس حال میں ہیں، آخر خیریت کا تو پتہ لگنا چاہیئے تھا۔ میں نے جب 'ب' کا شعر لکھا تو یقین ہو گیا کہ آج خط ضرور آ جائے گا ——— ہاں ضرور ——— بادِ شمیم تو شمیم صاحب کا خط ہی ہو سکتا ہے ———

——— باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

——— ساڑھے بارہ ہونے والے تھے "ضرور بھائی جان

ہوں گے "یقیناً خط آگیا ہوگا۔ وہ داخل ہوتے ہی مجھے آپ کا خط تھما دیں گے" میں نے سوچا —— اور بھائی جان گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرہ میں چلے گئے تھے۔ جب کوئی خط میرے نام آتا ہے تو آفس سے آتے ہی مجھے دیدیا کرتے ہیں —— لیکن آج وہ میرے کمرہ کی طرف نہ آئے تھے۔ کیا شمیم صاحب کا خط نہیں آیا —— ؟ اگر آیا ہوتا تو بھائی جان ضرور آتے ہی مجھے دیدیتے —— لیکن وہ تو اپنے کمرہ میں چلے گئے ہیں —— افسوس ——

میں نے لکھے ہوئے شعروں پر اک اچٹتی سی نظر ڈالی —— اور 'ب' سے شروع ہونے والے شعر کو دیکھتا رہا —— دیکھتا رہا۔ گھور گھور کر —— دیر تک —— پھر یہ شعر ہیں السطور لکھدیا ؎

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

موجودہ حالت میں 'ب' سے شروع ہونے والا یہ شعر زیادہ *Suitable* تھا —— میں نے 'ب' والا پہلا شعر کاٹ دیا —— پھر دیر تک سوچتا رہا —— کالج کی رنگین زندگی کے متعلق —— جس وقت ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکتے تھے۔ کلاس میں ساتھ ساتھ بیٹھتے —— پریکٹیکل بھی اکٹھے ہی کرتے تھے —— اور وہ لیبارٹری میں جبکہ ایک عجیب ہیئت کا لڑکا پروفیسر صاحب کو ملنے آیا تھا۔ تو اسکے مضحکہ خیز *Texture* پر ہم زور سے ہنس پڑے تھے —— جس پر اسے غصہ آیا تھا اور اس نے پروفیسر صاحب کے پاس ہماری شکایت کردی تھی —— اور یاد ہے جب پروفیسر صاحب نے ہم سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے کہا تھا کہ جمیل صاحب کہتے ہیں کہ "ان صاحب" کی شکل ایسی ہے جیسے "یاجوج ماجوج" کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں —— اور پھر پروفیسر صاحب بھی اس طرح کھلکھلا پڑے تھے جیسے ہماری تصدیق کررہے ہوں —— اور اصل بات کو بھول کر پھر حاضری لگانے میں مشغول ہوگئے تھے —— ہمارے پروفیسر صاحب کتنے اچھے تھے کہ جب پریکٹیکل کیلئے دو دو طلباء کا گروپ بنا تھا تو انہوں نے ہم دونوں کو اکٹھے رکھا حالانکہ آپ کا رول نمبر چھ اور میرا چھبیس تھا۔ —— اس وقت ہم کتنے خوش ہوئے تھے —— اور کالج کا ہیرو آپ کو یاد ہوگا۔ ارے وہی —— "شادی" —— جب ہم ایک کیمسٹری کے طالب علم سے اُلجھ پڑے تھے کہ میتھمیٹکس کے مقابل کیمسٹری کی کیا حیثیت ہے —— اور فیصلہ نہ ہوتا تھا تو میں نے کہا تھا کہ شادی سے فیصلہ لے لیتے ہیں —— اور شادی کی تو عادت ہے ہی کہ ہر ایک کی طرفداری کرتا ہے۔ جب اس لڑکے نے شادی سے کہا تھا کہ کیوں میاں شادی کیمسٹری اچھی ہوتی ہے نا میتھمیٹکس سے' تو اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا لیکن جب میں نے بڑے مدلل طریق سے شادی کو بتایا تھا کہ دیکھو میاں شادی میتھمیٹکس حساب کو کہتے ہیں۔ تمہیں پتہ نہیں کہ خدا بھی قیامت کو حساب ہی لے گا کیمسٹری کے متعلق نہ پوچھے گا —— تو شادی نے فوراً رائے بدل کر ہمارے حق میں فیصلہ دیدیا تھا۔ اس وقت ہم نے جب زور سے قہقہہ لگایا تھا تو وہی "یاجوج ماجوج" والا لڑکا

قریب سے گزر رہا تھا ——

—— اور بھی بہت کچھ میرے ذہن میں آرہا تھا۔ تمام واقعات ایک ایک کرکے دماغ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گزر گئے —— اور —— کالج کی یاد تازہ ہوگئی —— ہمارا پیارا تعلیم الاسلام کالج —— مجھے سوچتے سوچتے اونگھ آگئی —— چونکہ میں نے ٹانگیں میز پر رکھی ہوئی تھیں اور کرسی کا توازن صرف پچھلی دو ٹانگوں پر قائم تھا، اسلئے کرسی دھڑام سے جو پیچھے کو گری تو مجھے ضرورت سے زیادہ جاگ آگئی —— کرسی کے شور سے بھائی جان جو اپنے کمرہ میں سوچکے تھے جاگ پڑے اور تیزی سے میرے کمرہ کی طرف آئے —— میں جلدی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور کاپی جھاڑنے لگا۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا تھا ابھی یہاں؟ مجھے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تھی تمہارے کمرہ سے —— میں نے کہا کچھ نہیں ہوا یہاں تو میں نے بات ٹال دی اور بھائی جان واپس اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ پھر جلد ہی واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ کہنے لگے یہ خط تمہارے نام آیا تھا۔ مجھے دینا یاد نہ رہا تھا —— میں نے لپک کر خط لے لیا —— کھول کر پڑھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپ خیریت سے ہیں —— پھر میں نے اپنی رف کاپی اُٹھائی —— وہی صفحہ نکالا جہاں اس سے تھوڑی دیر قبل میں نے شعر لکھے تھے —— میں نے شعر دوبارہ پڑھنے شروع کئے —— میں نے 'ب' والا شعر پڑھا ؎

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

مجھے یہ شعر مناسب معلوم نہ ہوا۔ میں نے اُسے کاٹ دیا —— اتنا کاٹا کہ وہ جگہ سیاہ ہوگئی۔ پھر میں نے وہاں پہلا شعر دوبارہ لکھ دیا ؎

بادِ شمیم آئی خوشیاں سمیٹ لائی
مستی و شادمانی ہر ایک دل پہ چھائی

—— اور اب میں خوش تھا، بہت خوش۔ آپ کا خط جو آگیا تھا۔ خط بھی نصف ملاقات ہوتی ہے۔ اسلئے میرے اچھے شمیم! خط و کتابت میں کبھی سُستی نہ کرنا —— اچھا!

پچھلے دنوں خواجہ ناظم الدین صاحب لاہور میں پھر رہے تھے۔ ان کو اچانک ایک کام یاد آگیا اور ٹانگہ کی ضرورت پڑی۔ یہاں ہی ایک ٹانگہ والا ٹانگہ لئے کھڑا تھا جس کا گھوڑا باقی دُنیا سے بے خبر ایک بالٹی میں سے دانہ کھانے میں مشغول تھا۔ خواجہ صاحب نے ٹانگے کے قریب جاکر ٹانگے والے سے کہا کہ بھئی ٹانگے والے سیکرٹریٹ کا کیا لوگے؟ ٹانگے والے نے آہستہ سے جواب دیا کہ جو مرضی دے دینا۔ آہستہ سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں کہیں آپ کو گھوڑا نہ دیکھ لے۔

طنز و مزاح

ہمارا پڑوسی

ایاز محمود احمد خان

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب پتلے دُبلے سے رہائش پذیر ہیں جن کا کنبہ ماشاء اللہ صرف پندرہ افراد پر مشتمل ہے۔ آپ بہت ہی نازک اور آرام طلب واقع ہوئے ہیں۔ سردی گرمی اُن پر بہت اثر کرتی ہے۔ ہر موسم میں ان کے رنگ ڈھنگ میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بہت خوش اخلاق ہیں۔ پہلے دن آتے ہی کہنے لگے ——

"صاحب! آپ کے گھر سے دھواں ہماری طرف آتا ہے اس کا بندوبست کیجئے ——"

ہم نے بہتیرا کہا۔ بھائی صاحب! یہ تو ہوا کے رُخ پر منحصر ہے۔ کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی مغرب کی طرف۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ویسے باورچیخانہ بھی ادھر ہی واقع ہے' ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہاں اگر نقشہ بناتے وقت آپ مشورہ دیتے تو ہم کہیں اور بنوا لیتے۔ یقیناً یہ ایک غلطی ضرور ہو گئی کہ نقشے پر آپ کی تصدیق نہ کروائی —— فوراً جلال میں آکر کہنے لگے ——" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ارشادِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ہر کام میں ہمسائے کے سُکھ کا خیال رکھو"

بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور خیر و عافیت سے گھر پہنچا۔ نہیں تو ان صاحب کے تیور بگڑ رہے تھے۔ میں بھی عجیب ہوں۔ آپ سے ان کا تعارف تو کروایا نہیں۔ لیجئے! آپ سے ملئے! یہ ہیں ہمارے پڑوسی... جنہیں ان کے گھر والے آصف جنگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یوپی کے رہنے والے ہیں۔ اپنے آپکو "اردو کا باپ" سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جو لفظ آپ کو اُردو کی لُغت میں نہ ملے وہ آپ سے پوچھا جا سکتا ہے۔ انگریزی کے سخت دشمن ہیں اور اسے زبانِ کفار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین اخباروں میں "پاکستان میں انگریزی کیوں ——؟" کے عنوان سے انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ وسطِ ہند سے باہر کا کوئی شخص اُردو کا عالم نہیں بن سکتا۔ علامہ اقبال کے متعلق فرماتے ہیں کہ سیالکوٹ کا رہنے والا اُردو کیا جانے؟ بے تکی غزلیں اور نظمیں کہہ کر اُردو کا قادر الکلام شاعر کہلوانا انصاف نہیں۔ آپ اپنے بقول چوتھی پُشت سے شاہی خاندان سے متعلق ہیں۔ نہ جانے ایک دن کس سے زور زور سے اُلجھ رہے تھے —— "جانتے

نہیں ہو —— نواب زادوں سے ایسی گستاخی —— ؟

پتہ نہیں کس بیچارے سے گستاخی سرزد ہوئی اور کون بیچارہ شامتِ اعمال سے ان کے نزدیک جا بھٹکا تھا ویسے ہیں بہت ملنسار۔ ایک دن نہایت تمکنت سے فرمانے لگے ——

"بھئی ہمسائیگی میں رہتے ہو۔ کبھی ملتے ہی نہیں۔ آیا کرو۔ بیٹھا کرو۔ حال احوال سے آگاہ کیا کرو۔"

مگر سچ پوچھیے تو جس دن سے آپ حضرت ہمارے پڑوس میں آئے ہیں ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور اگر کبھی ضروری کام کے لیے جانا پڑے تو چکر کاٹ کر دوسری طرف سے نکل جاتا ہوں ——

اوہو! میں خواہ مخواہ طوالت میں الجھ گیا۔ میں تو ان کا تعارف کروا رہا تھا۔

لیجیے اب پہلے صرف تعارف ہی کراؤں گا۔

آپ بہت راستباز، نیک اور پابند شریعت ہیں اور علوم اسلامیہ کے خوب ماہر ہیں۔ جس کا پہلے دن ہی انہوں نے سکہ منوا لیا تھا۔ عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ صبح سویرے اندھیرے ہی انکے گھر سے بھنبھنانے کی آواز آتی ہے۔ پہلے دن تو بہت حیران ہوا۔ صبح سویرے ادھر دیکھا تو چھتہ وغیرہ تو کوئی نہیں تھا۔ بعد میں انکے صاحبزادے کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ ہر رات بارہ بجے سے چار بجے تک تسبیح و تحمید کیا کرتے ہیں۔

آپ کی کافی تعریفیں سن چکے مگر یہ آپ کی شخصیت کے تعارف کے لیے کافی نہیں۔ مگر میں بھی کیا کروں۔ میں گنوا بھی تو سکتا نہیں۔ انکی تعریفات بھی تو انفینٹی (Infinity) تک ہیں۔

ایک دن حضرت بازار میں مل گئے۔ "بھئی! گھر کے لیے سبزی لے جاؤ ——" میں نے کہا نوکر لیجائیگا فرمانے لگے نہیں اپنی پسند کی چیز لے کر جایا کرو۔ آؤ میں تمہیں لے دوں —— بہتیرا انکار کیا مگر انہوں نے وہیں سے سبزی کا آرڈر دیدیا۔ اٹھاتے ہوئے شرم آتی تھی مگر چاروناچار ان کے ساتھ سر کو نیچا کر کے چلدیا۔

اگلے ہی روز صاحب نے چھوٹے بچے کے ہاتھ کہلوا بھیجا کہ آج بازار سے گوشت نہیں ملا۔ اپنی ایک مرغی بھیج دیں تو مہربانی ہوگی۔ خیر مجبوراً ولایتی مرغی ان کے حوالے کی۔ اگلے دن ملے تو ہنس کر کہنے لگے ——

"بھئی مرغی تو واقعی بہت مزیدار تھی۔ اور ہاں اس کی قیمت بھی بتا دو۔"

میں نے ہنس کر یونہی کہہ دیا کہ آپ جیسے بزرگوں سے قیمت کیا لینی۔ تو داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے ——

"بھئی تمہاری بھی تو مول کی چیز تھی۔ ویسے اگر قیمت نہیں لینی تو تمہاری مرضی ورنہ مجھ سے چیک لے لیجیے ——"

دو چار دن کے بعد چھوٹا لڑکا آیا کہ اماں جی نے کہا ہے کہ کہیں سے خالص گھی تو منگوا دیں۔ بڑی مشکل سے اپنی تسلی کا گھی منگوا کر دیا۔ صاحب ملے تو بڑے جوش میں تھے۔ فرمانے لگے ——

"گھی تو واقعی خالص تھا۔ لیکن تم میں بری بات ہے کہ پیسے نہیں لیتے ۔"

میں یہ سن کر چپ ہو رہا اور دل میں کہنے لگا — کون کمبخت کہتا ہے پیسے مت دو؟ اپنی چیز تو مفت میں میں دیدی مگر اب بازار سے بھی خرید کر دوں۔

دل ہی دل میں بہت کڑھ رہا تھا کہ حضرت گویا ہوئے —— "ہاں بزرگوں کی خدمت کرنا سعادت مند بچوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ تم حقیقت میں با سعادت ہو دیکھو بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل بہت کچھ پاؤ گے"

اور میں "جی ہاں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اب تو ان حضرت سے گاڑھی چھننے لگی۔ جتنا میں ان سے گھبراتا تھا وہ اتنا ہی مجھ سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ شام کو آ بیٹھتے اور دس گیارہ بجے تک اپنے ارشادات سے محظوظ کرتے۔ ایک دن فرمانے لگے۔

"کیا تم نے میرا دیوان پڑھا ہے ——؟"

"کیا آپ شاعر بھی ہیں —— ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

تو نہایت مسخرانہ قہقہہ لگا کر کہنے لگے —— "واہ بھئی واہ تم ابھی تک اندھیرے میں ہی ہو۔ تمہیں صبح اپنا کلام دکھاؤں گا۔ پہلے تو میں ہر روز رات کے بارہ بجے تک شعر و شاعری کرتا تھا لیکن اب دو تین دن سے تمہاری خاطر شام کو ہی اٹھ پڑتا ہے۔ ہاں صبح کوئی کہتا ہوں"

میں نے دبی زبان سے جزاک اللہ کہا اور سمجھ گیا — وہ تین شعر و شاعری کی ہی۔ سمجھیں۔ نہ سمجھا کیا۔

"وہ آپ خواہ مخواہ میری خاطر اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اپنے ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کی" میرے منہ سے ٹائم ٹیبل کا لفظ سن کر بھڑک اٹھے اور فرمانے لگے۔

"تم جیسے نوجوانوں نے اردو کی ناک کٹوا دی ہے۔ ٹائم ٹیبل بولتے ہو۔ اگر تقسیم اوقات کہتے تو کیا اچھا تھا۔ ان ہی لیے تو ہم بیٹھے ہیں۔ کہ کوئی لفظ سیکھ جاؤ"

میں نے قدرے بغاوت سے کہا —— "معاف کیجئے اعلیٰ حضرت —— آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ خاک سمجھا رہا تھا لیکن پیٹ غصہ سے پھول رہا تھا۔

نہایت ہی ناصحانہ انداز سے گویا ہوئے ——

"دیکھا! اچھے بچے جلد ہی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ ہم تو اپنا قیمتی وقت صرف کر کے تمہارا فائدہ کرتے ہیں" اور ساتھ ہی فرمانے لگے —— "دیکھو بھئی تھوڑا سا [illegible] بھی منگوا دو" میں جو پہلے ہی اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا "بہت بہتر" کہہ کر جان چھڑائی۔

ایک دن صبح ہی صبح میں ابھی ناشتہ ہی کر رہا تھا کہ یہ صاحب دوڑتے ہانپتے ہوئے آئے۔ میں نے کہا۔ "حضرت تشریف رکھئے —— چائے نوش جان فرمائیے" —— فرمانے لگے —— "اجی چائے کیا پیوں گا —— بس بیگم صاحبہ ہی ناراض ہو گئیں"

"اوہو —— تو کیا وجہ ہوئی ان کی ناراضگی کی ——؟" میں نے پوچھا۔

فرمانے لگے —— "کیا بتاؤں آپ کو آج بیگم صاحبہ کانفرنس میں شرکت کر رہی ہیں تو انہوں نے فرمایا ہے کہ فوراً تیار شدہ (Ready made) ایک ریشمی سوٹ لائیں۔ اور جب تک سوٹ نہیں آئیگا ناشتہ نہیں کروں گی"

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا —— "کوئی بات نہیں بھئی آپ کو مارکیٹ سے آسانی سے کپڑے مل جائیں گے۔ تسلی ...

(باقی آئندہ)

امّی کے نام

پیاری ممی!

آپ کو یہاں سے گئے ہوئے یا مجھے یہاں اکیلے رہتے ہوئے آج پندرہ ماہ ہوئے۔ اس دوران میں آپ کے جتنے بھی خط آئے ان سب کا عنوان اس طرح شروع ہوتا تھا "تمہارا خط ملا پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوئی۔ ہم سب خیریت سے ہیں .... اور نہ جانے کیا کیا" ممی! مجھے آپ کا یہ دقیانوسی انداز بالکل پسند نہیں وہی پرانی باتیں — وہی روکھا سوکھا مضمون کہ بیٹا! "محنت سے پڑھو - مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔"

سنئے ممی! میں آپ کو ایک "لوجک" بتاؤں ——

آپ فکر نہ کیا کریں کیونکہ آپ جب بھی فکر کرتی ہیں تو یہ فکر آپ کو گھن کی طرح کھانے کی کوشش کرتا ہے —— اور پھر بیماری کا روپ دھار لیتا ہے۔ اسلئے فکر کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ ربوہ کو غنیمت جانتا تھا مگر یہاں بھی جان کے دشمن موجود ہیں کیسے لکھوں صبح و شام کیسے گزر کرتا ہوں۔ لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔ دن بھر دھینگا مشتی دھکم پیل رہتی ہے۔ تمہارا لڑکا جس کا نام جوجو ہے۔ یہ سب اسی کے طفیل ہے۔ لڑکا کیا مجھے تو سڑک کوٹنے والا انجن نظر آتا ہے وہ پھولے پھولے گال جیسے ہوا بھری ہوئی بلیڈر ہو۔ جب دیکھو باچھیں کھلی ہیں۔ رال ٹپک رہی ہے۔ بال پریشان عادات حیوانوں کی سی، پاؤ پاؤ بھر کے دانت بھلا کسی انسان کے کیوں ہونے لگے؟ ہر وقت جبڑے توڑ کر گرنے کو آمادہ رہتے ہیں۔ شرم تو شاید اس نے بھون کھائی ہے۔ حق ناحق راہ چلتے کمرے میں میدان میں میرے اوپر سایہ کئے رہتا ہے۔ سینہ اس کا چکی کا پاٹ ہے۔ دروازے میں کھڑا ہو جائے تو اجالا رفو چکر ہو جاتا ہے مجھ سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ پکڑا اور چانٹا رسید کیا۔ دبوچا اور مرغا بنا دیا۔ لپکا اور گردن ناپ دی۔ میرا دبلا پتلا نحیف و نزار جسم بھلا اس کی تاب کیونکر لا سکتا ہے۔ ایک دن میرے ناک کی پھنگی رگید دی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نتھنوں میں مرچوں کی چٹکی بھر دی ہو۔ واہ رے میری مجبوری -؟ سب سہا اور چپ رہا ——

مگر یہ جان کب تک؟ آج نہیں کل! بس پٹ ہی جاؤں گا۔ اور بوٹی بوٹی نوچ لونگا اس کی۔ پھر دیکھوں گا اس لٹھ مار کو کہ کس پانی میں ہے؟ اور سنئے! اپنے آپ کو حساب دان سمجھتا ہے —— مگر وبال تو یہ ہے کہ اسے

دیکھتی یہ مری ہستی گم ہو جاتی ہے۔ اگر معاملہ یہیں تک تو بات بھی تھی مگر وہ عقل کا دشمن اعلان کرتا ہے کہ میرے سچے تجربے کرتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ سب اسی کا دم بھرتے ہیں۔ اور میرے اوپر ظلم روا رکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ میرے دل میں بھی ابال اٹھا۔ اور میں نے بھی دوڑوں کے مقابلے میں نام درج کیا۔ صف بندی ہوئی تو میں بھی لنگر لنگوٹ کس کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ سیٹی بجی اور سب تیر ہوئے۔ میں نے بھی طرارہ بھرا مگر دس قدم پر ہی سانس پھول گیا۔ غصہ جو آیا تو برابر کے لڑکے کو اڑنگی دی تو وہ منہ کے بل گرا اور مٹی پلید کر گیا۔ اب جسے دیکھو دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے یوں گھور رہا ہے۔ جیسے اندھیرے میں سوئی ڈھونڈ رہا ہے اڑنگی کیا دی جنگ کا بگل بجا دیا۔ چوکھی جوتیاں اچھلنے لگیں۔ اور سب کی سب میرے سر پر برسیں۔ دیکھنے والو تمہیں کچھ انصاف سے کہنا کہ "یہ بھی کوئی شرارتوں میں شرارت ہوئی جس کے بدلے میں لونڈوں نے مجھے دھر لیا ——— اس دن سے بیانا میری درگت، ہوتی ہے۔ آپ کا رکھا ہوا نام تو جعلی سکے کی طرح تھوڑے ہی دن چلا ہے اور حالت یہ ہے کہ اب یہاں تو میرے ناموں کی ٹکسال کھل گئی ہے۔ نت نئے نام ڈھالے جاتے ہیں اور ہر دوسرے سے زیادہ وزن دار ہوتا ہے اگر گنوانے لگوں تو سارا خط ناموں سے ہی لپ جائے۔ صرف تین پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ ایک کرشن جی' دوسرا کرشن کمار اور تیسرا کرشن' ان کی مناسبت تو مجھے معلوم نہیں ——— لیکن ایک بات ضرور ہے کہ مجھے پہلا دونام پسند ضرور تھا۔

میں سارا قصور دوسروں پر تھوپنا نہیں چاہتا کوئی نہ کوئی بات خلاف وضع ہم سے بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ ابھی کل پرسوں ہی کی بات ہے جب میں کمرے سے نکل رہا تھا تھوکنے کی حاجت ہوئی تو بس تھوک ڈالا۔ اور سامنے آگے نکل جانے کو تھا کہ ایک مولوی قسم کے طالب علم نے شور مچا دیا اور لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

"بھلے آدمی برآمدوں میں نہیں تھوکا کرتے"

میں نے کہا "بھیا! شور کیوں مچاتے ہو۔ کان میں کہہ دیا ہوتا ہم آئندہ کے لئے محتاط رہتے" مگر وہ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا۔ جی میں آئی اس ڈیڑھ بالشت کے لونڈے کی چٹنی بنا ڈالوں۔ مگر قصور تو تھا ہی جل بھن کر رہ گیا۔ اس کی جسارت ملاحظہ ہو۔ ہاتھ پکڑ لیا اور مدد کو پکارنے لگا۔ جیسے چور کو پکڑ کر محلے والوں کو جگا رہا ہو۔ میری شامت آئی تو ادھر سے "حکیم" صاحب آ نکلے۔ انہوں نے بھی شاہی مزاج پایا ہے۔ اور سنیئے تو آپ مولوی صاحب نے کیا جڑ دی؟ کہ میں برآمدوں میں تھوک پھیلاتا ہوں۔ وہ تو بس آندھی کی طرح آئے اور اولوں کی طرح برس پڑے۔ "پچھلے سال کی اسکول کی جوتیاں یاد ہوں گی آپ کو۔ اب کیا کالج میں بھی ڈنڈا استعمال کیا جائے؟" میں نے تو احترام سے گردن نیچی کر لی آنکھیں زمین میں گاڑ دیں اور کان اور دماغ کی کھڑکیاں

کھول دیں۔ میں ان کے تیور کو تو دیکھ نہ سکا البتہ کرخت اور باریک لہجے میں ڈانٹ سنی اور جی بھر کر سنی ——— مجھ پر تو رعشہ طاری ہو گیا۔ کلیم صاحب نے ماشاء اللہ برآمدے ہی سے اشارہ کیا۔ میاں! وہ رہا "تھوک دان" وہاں تھوکا کرتے ہیں جی! خدا خدا کر کے جان چھوٹی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھانسی کی سزا معاف ہو گئی ہو۔ مگر سچ پوچھو تو اس دن کے بعد میں کچھ بجھا بجھا سا رہتا ہوں۔ ——— خیر اس حادثے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے "تھوکدان" کا پتہ چل گیا۔ ورنہ میں تو اسے کبوتروں کا دڑبہ ہی سمجھتا تھا۔ اور اسی خیال سے جب بھی کسی تھوکدان کے قریب سے گزرتا تھا تو غٹرغوں غٹرغوں شروع کر دیتا تھا۔ اب تو ٹھان لی ہے کہ ضرورت بلا ضرورت تھوک دان میں ہر روز کئی بار تھوکا کروں گا تاکہ لوگوں کو میری سابقہ لاعلمی کا پتہ نہ چلے۔ اور وہ اس چال کو سمجھ نہ سکیں۔

ممی! علم سیکھنا دل لگی نہیں ہے۔ بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ میں گھنٹوں کتابوں میں غرق رہتا ہوں۔ رات رات بھر میرے کمرے کی بتی جلتی رہتی ہے اور میں کتابوں کے ورق الٹ پلٹ کیا کرتا ہوں۔ کیمسٹری ساتویں بار دہرا رہا ہوں انگریزی کے "ایڈیمز" تو ایک ایک نوک زبان ہیں "الجبرے" اور "ٹرگنومیٹری" کے فارمولے اس طرح فرفر سناتا ہوں جیسے اخبار بیچنے والے اخبار کی سرخیاں پکارتے ہیں۔ جیسے منیر خان صاحب "ردل کال" کی میل چلا دیتے ہیں۔ فزکس میں بہت مغز پچی کرتا ہوں مگر بے سود۔ نہ ہی فارمولے یاد رہتے ہیں اور نہ ہی "ڈیفینیشنز" (EXPENSION OF liquids) اور (EXPENSION OF Solids) میرے خیال میں برابر ہیں۔ سنی سنائی باتوں کا اعتبار ہی کیا؟ ہم میں سے کسی نے اب تک تجربہ تو کیا نہیں کہ یہ دونوں مختلف ہوتے ہیں۔ پھر کیسے اعتبار کیا جائے؟

سب الم غلم دماغ کے کونوں، کھدروں اور تہ خانوں میں ٹھونستا رہتا ہوں ——— خدا کی مار "ٹرگنومیٹری" پر۔ یہ نقطے، قوسیں، خطوط، ضلعے، زاویے سب بڑھے شاعروں کی اختراع ہیں۔ دس دس کھیت لمبے ہندسوں کی نہریں ——— کیا کہتے ہیں "لوگ رتھم" اور سارا دن یہی کرتے رہتے ہیں۔ فرض کیا "تھیٹا" برابر ہے ۴۵ درجے۔ اسی طرح سارا وقت "فرض کیا یہ" "فرض کیا وہ" کے ہاتھوں الو بنتے رہتے ہیں میرا بس ہو تو یہ الجبرا اور یہ ...... سب ہاں! مگر مجھے پوچھتا کون ہے؟ ایسی پڑھائی سے باز رہا۔ مشکل تو یہ ہے کہ اگر دکان ڈالوں تب بھی حساب پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ——— خیر کچھ بھی ہو اس میں پاس ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور سنا ہے کہ جون ٹیسٹ میں اس میں پاس ہونا ضروری بھی ہے ورنہ .....

ممی! واللہ جھوٹ نہ بلوائے! یہاں کے لڑکے تو بس کتابیں مانگتے پھرتے ہیں۔ شاید یہاں کتابیں دینے کی ممانعت ہے اسلئے تمام لڑکے ٹال مٹول کرتے رہتے ہیں

پگڈنڈیاں

ندیم خاص

ایک دن کیمسٹری کا پریکٹیکل کرتے ہوئے اتفاق سے لیبارٹری انچارج سعید اللہ خان صاحب اور میرے کوٹ کا رنگ ایک ہی تھا۔ ایک دوست جو کہ بہتوں سے نادر حق چلے آ رہے تھے جلدی میں بھاگتے ہوئے آئے اور پیچھے سے میری کہنی کو جھٹکا دے کر ایک بڑی سی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "خان صاحب! ہائیڈروکلورک ایسڈ یہی ہے کیا؟" جونہی میں نے گھوم کر دیکھا۔ تو انہیں ایسا دھکا لگا جیسے بجلی کے تار کو چھو دیا ہو۔ بس پھر کیا تھا منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہوسٹل کی طرف ایسے بھاگے کہ اس دن دوبارہ لیبارٹری کا رُخ نہ کیا۔

مفلسی ایک بہانہ

پچھلے ہفتے جب ایک دن چنیوٹ جانے کا اتفاق ہوا تو بازار میں ایک اچھے خاصے ہٹے کٹے نوجوان آدمی نے میرے بھاگتے ہوئے سائیکل کو روک لیا اور مسمی صورت بنا کر کہنے لگا "بھائی صاحب! سیالکوٹ سے آیا ہوں۔ بیوی بچوں نے کل سے ایک نوالہ نہیں کھایا۔ اور واپس جانے کو پاس کرایہ بھی نہیں۔ خدا کے لئے کچھ دو۔" میں نے اس کے ہاتھ پر چند سکے رکھے اور یہ کہہ کر آگے چل دیا۔ کہ "بھیک مانگنا اچھا نہیں۔ ہٹے کٹے ہو۔ کچھ کام کرنا چاہیئے۔" جب واپس آیا تو وہی شخص ایک بڑی مٹھائی کی دکان پر تین چار روپے کی مٹھائی تلوا رہا تھا۔

بے صبری

دسمبر کا وسط تھا۔ ایک ہسپتال میں اکثر ڈاکٹر اور نرسیں بنڈل اٹھائے ایک خاص کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ باہر سے آئے ہوئے ایک شخص نے ایک ڈاکٹر کو کھڑا کر لیا اور پوچھا کہ "یہ کیا معاملہ ہے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا کہ جب ہم کسی دوست یا عزیز سے کوئی ایسا تحفہ وصول کرتے ہیں جس پر لکھا ہوتا ہے "کرسمس سے پہلے مت کھولیئے" تو ہم اسے لے کر فوراً ایکس رے روم میں پہنچتے ہیں۔ اس بنڈل کی ایکس رے فلم ہماری بے صبری

کو بھی وہ مٹا دیتی ہے اور ہم ایسے عزیز کے حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کرنے پاتے ۔ (ترجمہ)

معصوم معافی

میرے ایک دوست کا چھوٹا بھائی جس سے مجھے کافی محبت ہے دس گیارہ سال سے زیادہ کا نہ ہوگا ایک دن اس نے کچھ ایسی شرارتیں کیں کہ مجھے سخت غصہ آیا اور تب سے ننھے میاں سے بول چال بند کر دی ۔

دوسرے دن جب میں درس سننے مسجد میں گیا تو وہ بھی ساتھ ہی آ دھمکا ۔ نماز شروع ہوئی تو دیکھو پاس کے مقتدی کو ایک طرف سرکا کے جگہ بنالی ۔

نماز پڑھتے ہوئے کہیں میری انگلیوں کو مروڑتا کبھی کاٹتا ۔ جب ہم سجدے میں گئے تو وہ پھوٹ پھوٹ روتے ہوئے یہ دعا کرنے لگا "اللہ میاں رفیق بھائی کو راضی کر دے ۔ رفیق بھائی میرے ساتھ بول پڑیں"

میں نے بھی ارادہ کر رکھا تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہوں گا ۔ جب تک یہ درست نہیں ہو جاتا ۔ پھر درس میں بھی اس کی شرارتیں کم نہ ہوئیں ۔ چیونٹیاں چن چن کے مٹھی بھر لی اور میرے سامنے ڈال کے انگلیوں سے انہیں مسل دیا ۔ پھر کہنے لگا "رفیق بھائی ! تیر تیار ہے روزہ کھول لیں" بے اختیار میری ہنسی نکل گئی اور اس نے میرا ہاتھ کھینچ کے ملا لیا ۔ (رفیق احمد سیکنڈ ایئر)

نیا نسخہ

ہمارے ایک پروفیسر صاحب کل خاکسار کے غریب خانہ پر تشریف لائے اور میرے چھوٹے بھائی کی طبیعت صاف کر ڈالی ۔ اس نے پوچھا "یہ کس منطق سے حضرت ؟ میں نے کیا قصور کیا ہے ؟" فرمانے لگے "آپ کو معلوم نہیں کہ میں آپ کے بڑے بھائی کا استاد ہوں ؟"

"آپ استاد ہوں گے ان کے اور برس پڑے مجھ پر" اس نے چڑ کر کہا ۔

پروفیسر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا "بات یہ ہے کہ تمہارے بھائی پڑھ کر نہیں آتے امتحان میں بھی نمبر ضرورت سے ذرا کم لیتے ہیں اسلئے اس کی سزا تمہیں دی جاتی ہے"

وہ بیچارہ کچھ نہ کہہ سکا اور گھر آ کر ابا جان کے سامنے واویلا کیا کہ پڑھتے یہ صاحب نہیں اور مار ہمیں پڑتی ہے ۔ بس پھر کیا تھا ابا جان نے وہ توضیح کی کہ ہم اس دن سے باضابطہ طالب علم بن گئے

دوسرے دن پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیوں بھئی ! نسخہ کامیاب رہا ؟" ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "نسخے کی کامیابی میں شک کرنے والا کوئی کافر ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس نے ہم جیسے "بڑا خودسر" کو کتابوں کا عاشق بنا دیا ہے" پروفیسر صاحب اپنی کامیابی پر مسکرانے کی بجائے ہنس پڑے ———— بہت ہی کامیاب نسخہ ہے ۔ (شمشاد احمد جاوید)

گھنٹی اور نتیجہ ؟

جب فرسٹ ایر کا نتیجہ نکلا تو بہت سے لڑکے فیل تھے - جب شادی کو معلوم ہوا تو کہنے لگا ۔ "گھنٹی تو میں بڑے زور سے بجایا کرتا تھا معلوم نہیں اتنے لڑکے کیوں فیل ہیں ؟" —— ہم سب کھلکھلا کر ہنس دیئے کہ "گھنٹی اور نتیجہ ؟ دونوں کا کیا تعلق ہے — ؟"

شادی ہمارے چہروں کا تاثر بھانپ گیا اور بولا "بابو جی! آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں گھنٹی اور نتیجے کا بڑا گہرا تعلق ہے - اگر یہ بچے گھنٹی کی آواز پر کان دیتے اور باقاعدہ کالج میں حاضر ہوتے تو کبھی ناکام نہ ہوتے —— اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— اور ہم سب نے سر جھکا لیے ۔

(س - ز - ریاض)

تقدیر ؟

یہ غالباً ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے - ان دنوں میں راولپنڈی میں اپنے ایک دوست کے گھر مقیم تھا ۔ ایک دن شام کے قریب بڑی زبردست آندھی چلی - طوفانِ گرد نے تمام شہر کو ڈھانپ لیا ۔ تمام لوگ ڈر کے مارے گھروں میں دبک گئے - میرے دوست کا چھوٹا سا بھائی جس کی عمر بمشکل چار سال ہوگی ' گھبرا کر بھائی سے کہنے لگا "بھائی جان ہم رات کو کہاں سوئیں گے ؟" بھائی نے لاپروائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا —— "جیجی فکر نہ کرو خاک ہی ہمارا اوڑھنا اور خاک ہی ہمارا بچھونا ہوگا" —— وقتی طور پر بات ٹل گئی —— تھوڑی دیر کے بعد غل اٹھا —— اور معلوم ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی چھت سے گر کر ہمیشہ کے لیے خاک میں سونے کے لیے چلا گیا ہے - بھائی کو اپنی بات پر افسوس ہو رہا تھا لیکن تقدیر کے نوشتے ٹل نہیں سکتے ۔

(حمید احمد حمید)

"جائزے" —— بقیہ از صفحہ

● —— جمیل الرحمٰن ' محمد رشید اکبر ' سعید احمد اصغر ' خورشید جالندھری ' منظور احمد شاکر ہمارے نئے لکھنے والے ہیں ان کے متعلق ہماری دعا ہے کہ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

● "پگڈنڈیاں" —— اس کالم میں اس دفعہ کافی خیال افروز واقعات پیش کیے گئے ہیں لیکن تاہم یہ کالم ابھی تک آپ کی نگارشات کا محتاج ہے - آپ کے مخلصانہ مشوروں کا انتظار ہوگا ۔ (ادارہ)

تعزیت

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی!

۲۶ اپریل ۱۹۵۹ء کی اندوہناک شام اپنے دامن میں غموں کے طوفان سمیٹ لائی جب آسمانِ احمدیت کا ایک اور درخشندہ ستارہ موت کی پنہائیوں میں گم ہو گیا۔۔۔ یعنی حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے منہ موڑ کر ابد کے گہوارہ میں فروکش ہو گئے۔ کسی انسان کا ابدی زندگی حاصل کرنا اور مولائے حقیقی سے ملاقی ہونا یقیناً غم کی بجائے خوشی کا مقام تھا ہے لیکن ایسے عظیم انسانوں کا دنیا سے جدا ہونا بہرحال دنیا کی آنکھوں کو نمناک کئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر انسان کے عمل زندہ رہتے ہیں۔ انسان فانی ہے لیکن ایسے انسان جن کے اعمال غیر فانی ہوں وہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور رہتی دنیا تک ان کے نام صفحۂ ہستی کی زینت رہتے ہیں۔ حضرت مولوی صاحب حضرت مسیح پاکؑ کے پرانے صحابہ میں سے تھے اور جماعت کے ایک مخلص خدمت گار تھے۔۔۔ ایسے بزرگوں کا ایسے وقت میں جدا ہونا جب جماعت مصائب کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے یقیناً ایک بہت بڑا ابتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور جماعت کو ان جیسے مخلص اور بے لوث خدمت گاروں سے نوازے ؎

ہوں خدائے پاک کی تجھ پر ہزاروں رحمتیں
اے مسیح پاکؑ کے خادم صحابہ کے نشیں

اسی طرح دریں اثنا محترم پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب ایم۔ اے کے والد محترم چوہدری غلام محمد صاحب مرحوم بھی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے فضل و رحم کے سائے میں رکھے اور ان کی اولاد کو ان کی نیک صفات کا وارث بنائے اور دین و دنیا میں حافظ و ناصر ہو۔۔۔ ادارۂ **المنار** محترم چوہدری صاحب اور ان کے عزیزوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کی بلندیٔ درجات کے لئے دعا گو ہے۔

اسی طرح فضلِ عمر ہوسٹل کے ایک بے لوث کارکن محترم غلام قادر صاحب بھی اس دنیا سے کوچ فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کا بہتر اجر دے اور انہیں اپنی رحمتوں اور برکات کا وارث بنائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ادارہ المنار ان کی اہلیہ محترمہ اور ان کے عزیزوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

AL-MANAR

JUNE – JULY

1956

CONVOCATION NUMBER

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

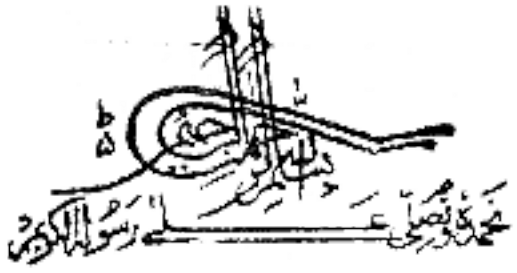

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

AL-MANAR

MAGAZINE

Talim-ul-Islam College

RABWAH

June - July
1956

●

Professor-in-Charge

MOHAMMAD ALI CHOUDHRI

Editor-in-Chief

IFTIKHAR AHMAD SHAHAB

Editors

MUNEER-UD-DIN AHMAD

SAEED ABDULLAH

HAMEED AHMAD

CONTENTS

1.	Editorial	1
2.	Botany at the Service of Mankind—*Syed Kalimullah Multani*	3
3.	In Memoriam	5
4.	When Nature Wants to Name a Man—*Anon* ...	6
5.	Pin-Pricks—*M. A. Ch.*	9
6.	Universal Conception of Human Rights—*M. A. Ch.* ...	10
7.	300 Miles on Pedals—*Rashid Ahmad Sh. Gilgitti* ...	19
8.	Let Me Talk—*Mohammad Islam Bhatti*	22
9,	When I had Wings—*Saeed Adbullah Somali*	23
10.	Mr. Prodigal—*Hameed Ahmad*	24
11.	Beauty—*Iftikhar Shahab*	26
12.	Lilliputian Era in Perspective—*Muneer-ud-din Ahmad* ...	27
13.	Hard Work—*Hamid Ahmad*	29
14.	Identical Twins—*H. S. H.*	29
15.	Hope—*Kibriya A. Moazzam*	30
16.	Are You a Cricket Fan—*Masood Ahmad Cheema* ...	31
17.	My Best Friend—*M. A. Shakir*	32
18.	A Personal Apology—*Syed Vali A. Shah*	34
19.	This is Somaliland—*Saeed Abdullah*	36
20.	College Round-up	38

Printed by S. A. Rashid, Managing Proprietor, The Lion Press, Hospital Road, Lahore, and published by A. R. Junaid Hashmi from Talim-ul-Islam College, Rabwah, West Pakistan

Almanar

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

No. II. | JUNE-JULY 1956 | Vol. V.

Editorial

BY a happy coincidence, the Convocation and the new admissions have synchronised this year. The raw material and the finished product, the adolescent and the adult, the child and the man, the 'kid and the patriarch' stand 'still and stare' for a passing moment across the gulf of years, eyeing, recognising and judging each other from a distance and then passing on, keeping the relentless rhythm of time and circumstance, each trying to live, to assert, to survive in its own way, gnawing its path in life and disappearing into the Great Unknown as the mist of years closes in on all sides. Without pretending to play the proverbial 'impartial spectators' we wish them all success and happiness. 'Students may come and students may go but the College goes on for ever.' This periodical replacement is the *elan vital* of all life. It is one of the fundamental principles of existence. We cannot afford to stand still. Inertia is death. Little wonder, therefore, if the life of the college too depends to a very large extent on this constant, organic and purposive growth and creative attempt at survival. Even a rabid dialectical materialist would agree that the dialectical process is a progressive approximation to truth and the realisation of the real and the ideal. Unfortunately the materialists emphasise the process but ignore its purpose and function. They try to confine the meaning of truth to the narrow frame work of their arbitrary view about reality. For them growth and survival mean physical growth and survival. They would measure man in quantitative terms by reducing him to the level of a lower animal and calculating his weight in terms of so many 'pounds of flesh.' To them man is nothing more than a 'lump of beef.'

Fortunately this is not the only way to evaluate man and his place and function in the universe. There is, for instance, the method which Islam advocates and which according to us is the only method that can save humanity today. Survival to us does not mean physical survival alone,

Physical satiety may be important but it cannot go all the way. "Better a Socrates dissatisfied than a pig satisfied." To us growth and survival mean the constant pursuit, promotion and perpetuation of values which transcend the limitations of time and space and are accepted by the rational and moral consciousness of man as the truest and most legitimate ends for humanity. Education, therefore, occupies an important niche in this general structure. For the entire problem is largely a matter of ends and means. As Muslims it is our duty to employ means which are not only effective but also moral in fact, as moral as the ends which they subserve. The problem of ends and means, however, is a separate problem and need not be discussed here. But we must be permitted to ask if our practice and profession, means and ends are self-consistent. Do we size up to the standards which we have prescribed for the Talimul Islam College ? It is no use pretending that we do. At the same time, it cannot be denied that we are trying to approximate to those standards through a determined, genuine and serious bid to raise the College from the level of a mechanical, quantitative and statistical robot to a moral and spiritual enterprise. We know our faults, at least some of them. Failures have also been there. But they should not dishearten us. They should, in fact, be the milestones on our way to the realization of our ultimate ideals. First Year, or sixth Year, with "trust in God and faith in the ultimate triumph of our cause, let us march on." We have a long, long way to go. We have not only to outclass every known college, we have also to outclass ourselves and continue doing so every moment of our lives. Therein lies the essence of all growth and survival — physical or spiritual.

We would, therefore, beg to remind the outgoing students that now that they are out of the portals of the College— their Alma Mater— it is their duty to prove the *bona fides* of its claim as a unique College. To the new comers we would say they should try to be the worthy successors to those who have gone before them. Let our present be greater than the past and future greater than the present. May God help us all in the realisation of our goal. May His will be done !

Mohammad Ali

Botany at the Service of Mankind

by

Syed Kalim Ullah Multani

Learn from the birds what food the thickets yield,
Learn from the beasts the physic of the field,
The art of building from the bee receive,
Learn of the mole to plow, the worm to weave

—*Pope.*

Many people who do not think of themselves as biologists spend their lives applying biological facts and principles. For example, the farmer must plant the right kind of crops that will grow in the right type of soil, must raise food and see that the animals are properly fed. Yet agriculture is only one phase of Biology that serves man. Medical and public health are to a considerable extent, dependent upon Biology. All drugs, whether obtained from plants or other sources, must be tested on animals. In each of the groups of plants and animals there are many species, which are beneficial to man.

Plants And Man: Although the majority of the plants are useful they are used in different ways. There are two major groups of plants known as lower plants and higher plants, both useful and harmful varieties.

Algae, fungi and bacteria are useful. From the brown algae, we obtain iodine; from the red seaweed, agar-agar, a subtance used in medicine. Fungi are famous for their role in yeasts, in bread-making and in preparing industrial alcohol. Yeasts are at present much advertised as a source of vitamins, particularly vitamin B.

Sometimes important plant diseases are caused by harmful fungi, for example, wheat rust, chestnut etc.

Bacteria are so important that they are usually considered by themselves. Without bacteria the world would soon be filled with dead organisms. They play an important role in the nitrogen cycle. Without them cheese-making and butter-making would be impossible. They are responsible also for the "curing" of tobacco and for the separaion of flax fibres. These fibres are used in making linen.

On the other hand bacteria cause many diseases of both plants and animals. They may be carried by the air, as is the case of tubercular germs, typhoid bacilli, or they may be carried by insects and other animals, for example, the bacteria of plague are carried by rats and transmitted to man by fleas.

Economic importance of the plants:

Ferns: These are extensively used as ornamental plants

They have played an important part in the formation of coal.

Seed Plants: The seed plants furnish man with so many types of suppliers that it is difficult to mention all.

Food plants belong to the family of gramineae which include the great crop plants, wheat, corn, barley, rice and sugar-cane. The seeds of these plants constitute the major part of our food. Corn is used in making industrrial alcohol, pith of the corn-stalk is of value in packing and making explosives. The soya-bean is becoming more and more important as a food and for the oil contained in the seed which is used in the paint industry, the cake is used as a fertilizer. Nodules on the roots of leguminous plants, contain nitrogen fixing bacteria. These plants play an important role in soil-building.

Cotton: Cotton is cultivated for its fibre. These fibres were employed in making cloth as far back as 3000 B. C. Cotton fibres contain cellulose, a little fat and some protein. Products from the fibres are cotton thread and textiles, and rayon often used in place of silk. Gun-cotton is used in the manufacture of explosives, celluloid, collodion and many other products.

Products from the cotton seeds, are, for instance, oil and cake. Oil is used in cooking, soap-making and in butter and lard substitutes The cake is used as a fertilizer.

Rubber: Rubber is made from the milky juice (latex) of many members of the family Moraceae. The best crude rubber is obtained from the para rubber tree (Hevea braziliensis. Gutta-percha made from the milky juice of a plant somewhat like the rubber plant, is a hard, firm material used in many ways in addition to covering submarine cables.

Tea & Coffee: Tea was made from the plant Theasinensis in China as long ago as 2700 B. C. The leaves of the plant are plucked and dried, and the type of tea depends upon its preparation. Green tea is from leaves that have been dried quickly, black tea is prepared by allowing the leaves to dry slowly, while some fermentation occurs. The stimulating effect of tea is a drug known as theine. Tannin is also present.

Coffee comes from two shrubs coffea arabica and coffea liberica. It is made from the berries. These berries contain a volatile oil. The aroma is derived from the substance produced in the roasting of the berries. The presence of the drug caffein gives to coffee a stimulating effect. Cocoa comes from the seed of the cocoa tree. The stimulating effect comes from the drug theobromine, present in the cocoa beans.

Drugs: Every country has its own medicinal plants and there are thousands of them.

Opium is an important drug. Relief of pain is produced from the

dried milky juice of a poppy capsule. It contains morphine. Quinine is another important drug which is used in the treatment of malaria. It is obtained from the bark of the Cinchona tree. It is named after the Countess of Chinchon, the wife of a viceroy to Peru, who was cured of fever by the use of the bark in 1628. Digitalis is of great value in the treatment of heart diseases. It is obtained from the ornamental foxglove (Digitalis). Atropine is obtained from the plant Atropa belladonna, and is used by opticians. It paralyzes the eye muscles of accommodation so that the optician is able to see the structure of the eye. Chanlmoogra oil is obtained from the seeds of the chanlmoogra tree and is important in the treatment of leprosy. Turpentine is used in making paints and varnishes and is used as an antiseptic. Pine is a tree used in making charcoal. Cork is the bark of the cork tree. It is stripped from the tree when it is about 20 years old.

IN MEMORIAM

We place on record our deep sense of grief and loss at the sad demise of :

Hazrat Soofi Muti-ur-Rehman Bengali, Hazrat Sahibzada Mian Abdussalam Omar, Hazrat Maulvi Ghulam Nabi Misri, Babu Abdul Ghani father of Mr. Abdur Rasheed Ambalvi and Choudhri Ghulam Muhammad father of Prof. Choudhri Muhammad Ali,

and pray that may God shower His love and blessings on their souls.

When Nature wants to name a man

When nature wants to drill a men,
And thrill a men,
And skill a men,
When Nature wants to mould a men
To play the noblest part
That all the world shall praise -
Watch her method, watch her ways!
How she ruthlessly perfects
Whom she royally elects;
How she hammers him and hurts him
And with mighty blows converts him
Into trial shapes of clay which only nature understands -
While his tortured heart is crying and he lifts beseeching hands -
How she bends, but never breaks,
When his good she undertakes ...
How she uses whom she chooses
And with every purpose fuses him,
By every art induces him
To try his splendour out -
Nature knows whate she's about.
When Nature wants to take a man
And wake a man
And shake a man
When Nature wants to make a man
To do the future's will;
When she tries with all her skill
And she yearns with all her soul
To create him large and whole ...
With what cunning she prepares him;
How she goads and never spares him,
How she whets him and she frets him
And in poverty begets him....
How she often disappoints

Whom she secretly anoints,
With what wisdom she will hide him,
Never minding what betide him
Though his genius sob with slighting and his pride may not forget,
Bids him struggle harder yet.
Makes him lonely
So that only
God's high messages shall reach him
So that she may surely teach him
What the Hierarchy planned.
Though he may not understand
Gives him passions to command
How remorselessly she spurs him ;
With terrific ardour stirs him
When she poignantly prefers him.
When Nature wants to name a man
And fame a man
And tame a man
When Nature wants to shame a man
To do his heavenly best.....
When she tries the highest test
That her rekoning may bring-
When she reins him and restrains him
So his body scarce contains him
While she fires him
And inspires him.
Keeps him yearning, ever burning for a tantalizing goal-
Lures and lacerates his soul,
Sets a challenge for his spirit,
Draws it higher when he's near it-
Makes a jungle, that he clear it :
Makes a desert, that he fear it
And subdue it if he can-
So doth Nature make a man.
Then to test his spirit's wrath

Hurls a mountain in his path-
Puts a bitter choice before him.
" Climb, or perish,,' so she says...
Watch her purpose, watch her ways !
Nature's plan is wondrous kind
Could we understand her mind...
Fools are they who call her blind.
When his feet are torn and bleeding
Yet his higher powers speeding
Blazing newer paths and fine.
When the force that is divine-
Leaps to challenge every failure and his ardor still is sweet
And love and hope are burning in the presence of defeat...
Lo, the crisis ! Lo, the shout
That must call the leader out !
When the people need salvation
Doth he come to lead the nation.....
Thus doth Nature show her plan
When the world has found a man !

OXFORD CULT

An explorer was going about his business in darkest Africa when a hungry cannibal tribe bagged him in full flight and considered its Sunday-dinner problem solved. He weighed about two hundred pounds on the hoof and there were murmurs of genuine satisfaction when they seasoned him with salt and lowered him into the pot. He was just beginning to simmer when the cannibal chief remembered his manners.

"Jove," he ejaculated, "you sound like an Oxford graduate. What college ?"

"Balliol," gasped the half-baked explorer.

"Release this man," cried the chief, "Balliol men never eat one another!"

Pin–Pricks

M. A. Ch.

In the last issue of Almanar, Mr. Basheer-ud-din Ahmad described Prof. Akhwand M. Abdul Qadir, Prof. of English as our "English Professor." He meant it !

Ch. Naseer Ahmad took his 'first class' in Zoology on June 20, 1956. We wish him another "first class" in the University Examination.

As usual the first year babes have again invaded the College Campus in large numbers. An added reason why milk should be available at the Tuck-shop !

On the occasion of the Hostel Union's trip at Burj, some members of the party are reported to have tried to perform the classical "rope trick." Luckily, the amateur magicians could not be detected !

Thanks to the gauzed doors and windows of the Tuck-shop, the flies were kept under complete control this year.

They were not allowed to get out !

Professor N. A. K. claims that his Kabaddi team led by himself, won the aquatic Kabaddi match at Burj.

We agree. Of course, to stop the controversy !

We are reliably informed that at the *sherbet* party given after the convocation ceremony Mr. Abdullah Abu Bakar had to consume a Jugful of saline *lassi* as an appetiser before he was allowed to touch the mango squash. Our sympathies !

Apropos the Convocation, Prof. Z. A. V. is reported to have 'thrown cold water' on all and sundry deliberately according to a preplanned scheme' and successfully defied the hot winds of June for a refreshing half an hour. No one, however, knows why he took the first available train to Burj immediately after the termination of the ceremony !

Universal Conception of Human Rights

[Being a lecture delivered by Prof. Ch. Muhammad Ali, M.A., at the Symposium of the First Session of the Pakistan Philosophical Congress, held at Lahore under the auspices of the Panjab University.]

The problem of human rights is bound up with the relative status of the individual and authority, particularly the authority of the State. Since the time of the ancient Greeks, there has been an age-long battle between those who prize individual freedom and those who value authority. It will take too long to give even a brief survey of the different theories that have been advanced from time to time with a view to defining the degree of control that the State or the group can legitimately exercise over the individual. It is difficult to dichotomise these theories into mutually exclusive classes, but on the whole we may say that there are two main points of view basic to the great mass of recent writings which deal with this problem.

On the one hand, there are thinkers like Plato and Nietzche and a host of their followers, who support the view that inequality is the natural state of man, and society is the supreme regimented hierarchy of the individuals. Consequently, each member of the State must take his proper place in the social structure. 'The Philosopher King' and the 'Superman' have the natural right to dictate, and the subjects have no right to question the decisions of their superiors. They must rest content with playing a secondary role in the tightly organized system. Hegel, Marx and others carried this view-point to its logical conclusion and held that certain groups or States were by nature superior to others and had the absolute right to rule. This, of course, is the distinct characteristic of all totalitarian systems.

Opposed to this entire trend is the democratic tradition, the main exponents of which are men like Locke, Rousseau and their followers. They emphasize individual freedom and private enterprise.

Both these standpoints are two extremes. To my mind, the most acceptable is the Islamic point of view which avoids both the extremes and tries to effect a synthesis of the two but without their defects.

Islam recognizes that society is a realm of ends, ends being the individuals. Unlike Hegelian idealism, it does not hold that society or State is an end in itself, and that the individual exists for the sake of society. Instead, it believes that the individual is an

end in himself and the State is a means to this end. The State can and should exercise only that degree of control over the individual which is the minimum necessary for purposes of national security, international peace and the dispensation of public justice. Beyond that the State has no right to trespass over the freedom of the individual. The State exists for the individual and not the individual for the State. Therefore, Islam tolerates no regimentation of thought. The Holy Quran declares in the most unambiguous terms.

لا اكراه فى الدين (بقره ع ٣٣)

"There is no compulsion in religion." (2 : 256)

قل الحق من ربكم فمن شاء فليؤامن و من شاء فليكفر - (الكهف ٣ ع)

"Tell them, this is the truth from your Lord ; whosoever wishes, he may believe ; and whosoever wishes, may disbelieve." (18 : 30)

لست عليهم بمصيطر (الغاشيه)

"You are not placed over them as a task master." (88 : 23)

And apart from the freedom of thought it also guarantees the freedom of expression. The Holy Quran says :

و ما علينا الا البلاغ المبين (يٰسٓ - ع ٢)

"Our duty is merely to convey the Truth." (36 : 18)

It is hardly necessary to comment on this charter of human freedom. It guarantees complete freedom of thought and expression to the individual. It leaves no room for a professional priestly class or an official church. Each individual is responsible for his actions, and he alone is the sole judge in matters of conscience and belief. No one, not even the head of the State, has the right to force the humblest of citizens into or out of what he believes to be true or false. The individual is free to choose and to declare his belief. True, there has emerged, at different occasions, a class of people who have arrogated to themselves the right to judge for others, and have paraded as the custodians of public morals and the keepers of social conscience. But such people have never had the sanction of the Islamic Law at their back. The incalculable harm this class has done to the cause of Islam and individual freedom is a matter of history. The current misconceptions about Islam, particularly in the West, are mainly due to these people. It is even said that Islam was spread by force and that Islamic Law allows apostates to be put to death. Nothing could be farther from the truth. **Islam is the religion of freedom, freedom of thought, freedom of expression and freedom of belief and conscience.** It recognizes no external authority, not even the authority of the State in matters of religion and conscience. The only authority it recognizes is the authority of reason which implies the absence of fear and coercion, and signifies the fullest expression of the human self and is to be distinguished from the narrower Kantian sense.

The Holy Quran clearly says :

ليهلك من هلك عن بينة و يحيى من حي عن بينه (الا نفال - ع ٥)

"So that he may perish whosoever perishes on the basis of evidence, and he may live whosoever lives on the basis of evidence." (8 : 43)

It might, however, be asked that as Islam is a religion, it cannot with consistency afford to demolish authority, particularly divine authority. Divine authority is, in fact, the end-all and be-all of all religions. The revealed word is a categorical imperative and is absolutely binding as being true, regardless of the qualms of conscience or rational doubt it may occasion in the mind of the believers. It is pointed out that religion means faith, and that faith is something which does not admit of rational measurement and judgment, that religious experience is a direct and immediate experience which is accepted by its recipient, and through him by his followers as an unchallengeable truth, and that all along religion is an *argumentum ad verecundiam* except that the authority it invokes is very remote and has come to have a halo of mystery and tradition which invests the experience and its origin with a kind of reality. It is also pointed out that religious values are not demonstrable and inductive values.

This, however, is based on misconception. It is unfortunate that the Islamic view regarding truth and its acceptance as such is not yet generally accessible. It may, however, be noted that religious experience, in order to be accepted as true, must needs satisfy the known and e s t a b l i s h e d canons of scientific induction. It must be considered at par with ordinary human experience and should admit of being stated in empirical terms. The fact that it is highly subjective does not make it any the less susceptible to scientific treatment. Experience as long as it is experience cannot get out of the quagmire of subjectivity. In fact, experience always presupposes a subject. Berkley and Hume's subjectivism is not wholly an extremist point of view. Even Kantian distinction between phenomena and noumena rests on the same foundation. Descartes' *Cogito ergo sum* shows that the major premise of the system he tried to raise, consists of the Cogito or the subject. Even Russell with all his talk about truth as a neutral stuff cannot help calling it a subjective-objective m o n i s m. Hence religious experience does not suffer in truth by being subjective. But if it is to be accepted as being true, it should be capable of being judged by the general mass of mankind to whom it addresses itself. Truth values cannot be proved or disproved by *a priori* methods alone. All generalisations involving such values must needs fulfil the basic conditions of scientific induction. It is on the basis of this d e m o n s t r a b l e, verifiable, and inductive proof that the claims of a prophet or, for that matter, of any true experience, should be based and accepted as being valid by the r a t i o n a l

conciousness of man. Religious experience may be different from ordinary experience, but by virtue of this difference it does not cease to be an experience. The belief in a transcendental reality and the revealed word is not based on any magical and compulsive regard for the unknown or the mysterious. Instead, it is based on the firm bedrock of reason, experience, self-consistency and induction, and is finally demonstrable and verifiable. Even to the man who cannot immediately enter into this experience, the testimony of those, who can so enter, is not against the fundamentals of reason and should not be confused with authority. Testimony is not authority. It is second hand observation. It is based on a scrupulous regard for truth and does not exclude the possibility and right of direct experience. It is employed by all sciences and is accepted as reliable as direct observation. Therefore, faith or belief in the revealed word is not un-inductive. We believe in it as we believe in the observation and testimony of any reliable scientific observer. In a testimony of this kind, or for that matter in all scientific induction, the appeal is to facts. Once we are sure of the ground of our generalisation, and it is found to be guaranteed by facts, we can go ahead with confidence from the known to the unknown, from some to all.

This predictive risk, this faith in the inductive method, this scrupulous regard for truth is what constitutes the quintessence of modern scientific generalisation. No blind faith or mere dictation, but faith founded on facts. Truth, in order to be true, must be found to be so and must be amenable to standard scientific tests and scrutiny. Influences that are likely to prejudice or otherwise vitiate our judgment are denounced by Islam. *Shirk*, or regard for the false gods of custom, habit, wealth, power, etc., is the greatest sin in Islam. Hypocrisy or *Munafiqat* or dishonesty of thought, committed through conscious choice, is the next worse. And the most cardinal value is to deny all gods except God, the custodian of Truth, Justice and Fairplay, and to accept His Prophet as His humble servant, and a Messenger without conferring any supernatural status on him.

انا بشر مثلكم يو حى الى (الكهف ع ١٢)

'I am but a man like unto you : (but it is only that) God has revealed to me.....'. (18 : 111)

It is in this context that the Holy Quran again and again exhorts us to think and ponder, judge and measure the message and the Messenger, and to subject them to the closest and the most critical scrutiny, even though the facts on which the message is based are definite, clear and incontrovertible. Says the Holy Quran :—

لعلهم يتفكرون (اعراف ع ٢٢)

That they may think. (7 : 177).

او لم يتفكر ما بصاحبهم من جنة (اعراف ع ٢٣)

Do they not reflect ; their companion is not of the insane ?
(7 : 185).

فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين (التوبه ع ١٥)

Why not a party from each come forward to acquire an understanding of the faith ? (9 : 123).

افلا يتد برون القران (النساء ع ١١)

Will they not then meditate on the Quran ? (4 : 84).

ليد بروا اياته (ص ع ٣)

That they may ponder over its verses. (38 - 30).

Thus it sets up reason and rational methods as the sole criterion of truth. It does not allow the use of force to stifle thought, for force may silence but cannot convince. As a matter of fact, it cannot even silence. That is why the Holy Prophet Muhammad (on whom be peace) said that honest difference of opinion is a blessing. A society or a State, which does not tolerate difference of opinion or denies even the right to beg to differ, cannot with consistency attach value to truth, honest thinking and freedom of judgment. Coercion breeds distrust and hypocrisy. It also betrays a serious lack of proof and argument. That is why the Holy Quran declares :

لا اكراه فى الدين (بقره ع ٣٣)

"There is no coercion in Islam." (2 : 256)

It, therefore, leaves no room for the regimentation of thought and purpose brought about under duress. It is in this context that the place of the moral reformer is to be considered. He raises his voice against the established order

قل هل يستوى الا عمى و البصير افلا تتفكرون (الانعام ع ٥)

Are the blind and the seeing alike ? Do you not then ponder ? (6 : 51).

ان فى ذالك لا يات لقوم يتفكرون (رعد ع ١)

Surely there are signs in this for a people who reflect. (13 : 4).

كذالك نفصل الايات لقوم يتفكرون (يونس ع ٣)

Thus do we enumerate and explain in signs for a people who reflect. (10 : 25).

ان فى ذالك لاية لقوم يتفكرون (النحل ع ٢)

Surely there are signs (in nature) for a people who reflect. (16 : 12).

كذالك يبين الله لكم الايات لعلكم تتفكرون (بقره ع ٢٧)

Thus does Allah make plain to to you His signs that you may think. (2 : 220).

قد بينا لكم الا يات ان كنتم تعقلون (ال عمران ع ١٢)

Certainly, we have explained to you the signs only if you understand. (3 : 118).

لعلكم تعقلون (بقره ع ٩)

So that you may understand. (2 : 74).

افلا تعقلون (بقره ٨)

Have you then no intelligence ? (2 : 45).

افلا تتذ كرون (الا نعام ع ٩)

Are you not, there fore, fully reminded ? (6 : 82)

through constitutional means. He is allowed perfect liberty to judge the current values that obtain in a particular society. He is further allowed to express his judgments and opinions publicly. In other words, not only is he allowed to think but to think aloud. In this sense he is a true revolutionary. And the revolution he tries to bring about is the bloodless and the peaceful revolution in the realm of ideas and values. But he is not an anarchist ; nor is he a frustrated maniac. His methods are not self-contradictory ; he does not preach freedom and practise force and coercion to impose his views on others. Reason and proof are the only weapons in his armoury.

He appeals directly to the consciousness of the individual. His duty is merely to convey his message.

وما علينا الا البلاغ المبين (يس – ع ٢)

And our duty is only to convey the message of Truth. (36 : 18)

It is for each individual separately to believe or not to believe, accept or not to accept. It is none of his business to force people to believe as he does and compel them to conform to his views. The Holy Quran emphatically declares :

قل الحق من ربكم فمن شاء فليومن ومن شاء فليكفر (الكهف ع ٤)

Tell (them), this is the Truth from your God. If you like accept it, if you like, reject it. (18-30)

And if people do not accept his message he is not held responsible for what they choose to do. For similar reasons, Islam does not allow the individual the right to physical revolt against the society whose member he happens to be. This is to emphasize the need and role of freedom in matters of belief and conscience, and to insulate the social structure against disruption and anarchy. It, however, grants to the individual the right to disagree and express that disagreement publicly. But he has no right to revolt and use force to prove the *bonafides* of his case, or to counter the force of social opinion by rising in armed rebellion. It distinguishes between reform and revolt, change and destruction. It believes in change and reform through peaceful, just and fair methods.

If society does not give to the individual the right to reform and disagree, that is, if it does not give him the right and chance to think and act honestly, and forces him to forsake his views under threat of pain, then Islam recognizes the individual's right to leave that society and migrate to some other place, where he can hold views consistent with the verdict of his reason and conscience and can suit his actions to his beliefs. But it does not allow him to retaliate in kind. Thus, except for defence, Islam banishes the use of swords, and encourages the freedon of thought and expression. That is why the Holy Prophet (on whom be peace) encouraged the spirit of inquiry and scientific outlook placing a premium on the Socratic maxim, that virtue is knowledge,

and advised the Muslims to acquire knowledge even if they had to go to China. Islam thus demolishes all barriers to free thought. Kant very nearly summed up the Islamic position when he pointed to "the starry heavens above and the moral law within." Thus to my mind, what may be called the quintessence of Islam, is the twin principle of the Divine Law and the right of the individual to judge and accept or reject that law in the light of the verdict of his own reason and conscience. The false gods or what Bacon calls the idols of the tribe, den, market and theatre are once and for all dethroned and removed from their pedestals and levelled to the ground. Be it a State or a superman, the proletariate or a majority party, power or wealth, Church or custom, none has the authority though it may sometimes conspire to have the power, to dictate and suppress freedom.

On the other hand, while Islam safeguards the freedom of the individual, it also recognizes the negative possibilities of what Plato would call the mob rule. In the words of Russell, " A society, where each is the slave of all, is only a little better than one, where each is the slave of a despot." Individual freedom in democracy is only skin deep. It is more apparent than real. The so-called freedom of individual enterprise results in rank social and economic injustice. The capitalist class holds the reins of power, wealth and propaganda. True, it allows opposition to government policies and freedom of belief and propaganda, which is not allowed under totalitarian systems, and is, therefore, to be preferred to them to that extent. But even under democracy opinion is too highly organized to allow any scope for free and independent thinking. The independent member of the house is a solitary and an amusing figure, who has no authority and a doubtful future unless he gives up his independence and decides to merge with some party. In fact, communism is the direct result of the economic and social injustices that have been committed in the name of democracy. The choice, therefore, has to be made between Marxism and Democracy, police rule and mob rule, regimentation and licence. These may be catch-phrases but they do bring out the inherent defects of either side. Islam tries to avoid these extremes and tries to follow the middle course. Like Plato it does not foist a superior intellectual aristocracy denying the workers and women even the right to think for themselves. Nor does it impose an absolute autocrat, whose will is law and who is responsible to none except himself as is done by Nietzsche and others. It does not set up a "classless class" of a ruling hierarchy which considers the freedom of the individual a dangerous tendency and a bourgeois illusion, and thinks of religion as the opium of the masses denying even the right to think otherwise.

In Islam the Caliph or the head of the State is a Constitutional Head with a Divine Law and Constitution that is, the Holy Quran. He is duly

elected and is not above this Law and Constitution, which he is bound to obey most scrupulously in all its details and which he himself has accepted on the basis of reason. He cannot cancel or modify any part of the law. He is, however, not bound to submit to the dictation of mere numbers or a blind majority. Within the Law, he can exercise his discretion to save a Socrates or a Christ from the fury of the mob. But he does not and has no right to violate or flout the Divine Law and Constitution. It is his duty to see that the vested interests do not make it difficult for the humblest of citizens to think freely. It is clearly laid down that he must invariably seek advice. The Holy Quran says :

شاور هم فی الامر (ال عمران ع ۱۷)

"Seek counsel from them in the affairs." (3 : 159) Again, it says :

امر هم شوریٰ بینھم (شوری ع ۴)

They take decisions after mutual consultation. (42 : 39)

Thus it is necessary that no taboo is placed on offering free advice. Conditions should be created which are conducive to the free exercise of the right to vote. The Holy Quran makes it a condition precedent to the right to vote, that the vote must go to the deserving person. It says :

ان اللہ یا مر کم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا

(نساء ع ۸)

Surely, Allah commands you to make over trusts to the deserving of it. (4 : 59)

In the Islamic State none is too humble and unworthy to offer advice and none is too great and perfect to receive it. The only codition is that advice must be positive and constructive, honest, just and fair and must not militate against the legitimate rights of other individuals.

The Holy Quran says :

و اذا قلتم فاعد لوا (الانعام)

"And when you speak, be just." (6 : 154)

As a further precaution against injustice, the judiciary is guaranteed complete independence. Even the Head of the State can be summoned to a judicial court as an ordinary citizen. No considerations of fear or favour should weigh with the court, and it must not allow its impartiality to be corrupted at any cost. It further refuses to accept any distinctions between man and man. Even the Holy Prophet (on whom be peace), who to the Muslims is the best and the greatest of human beings, is to be taken as a human being. The Holy Quran says :

انا بشر مثلکم یوحیٰ الی (الکہف ع ۱۲)

"(O Prophet of God), tell them, I am a man like unto you except that I am the recipient of divine inspiration." (18 : 111)

It is not possible to discuss here the detailed rules laid down by Islam to ensure justice and equity and abolish all economic, social, cultural and intellectual exploitation of man and woman alike. While it tries to draw the line between freedom and licence, it clearly defines the rights and duties of the State and the

individual. It prescribes effective safeguards at the individual, national and international levels against all kinds of agression, and tries to stop the vested interests from making inroads against the rights of the individual. It raises the individual from a mere means to the exalted position of an end, from a biological specimen to a human being, the best of God's creation and offers limitless possibilities for the realization of the best in him.

It is to be hoped that after having suffered tremendous losses in men and material, human dignity and moral worth, man may yet save himself and rediscover Islam. I cannot help quoting here the concluding passage of Bertrand Russell's book 'Religion and Science, in which he says :—

"Those to whom intellectual freedom is personally important may be a minority in the community, but among them are the men of most importance to the future.....If they are prevented from doing their work and having their due effect, the human race will stagnate, and a new Dark Age will succeed, as the earlier Dark Age succeeded the brilliant period of antiquity. New truth is often uncomfortable, especially to the holders of power ; nevertheless, amid the long record of cruelty and bigotry, it is the most important achievement of our intelligent but wayward species."

Thomas Craven, the author of *Men of Art*, has a young son who was asked by his history teacher to name the principal contribution of the Phoenicians. The youngster's answer, given without hesitation, was : "Blinds."

300 Miles on Pedals

by

Rashid Ahmad Sheikh

"Ay ! Why not have a trip to Lyallpur on foot ?" Vali casually suggested on New Year's eve.

I was in a very gloomy mood. The days after the Annual Gathering are always very gloomy and blank, particularly for those hostel students who do not enjoy the luxury of a nearby home to which they can go and spend their holidays.

Almost everybody had gone to enjoy the post-*Jalsa* holidays. Time was hanging heavy. The suggestion was a God-send and was accepted with alacrity.

"O yes, by all means. But let it be on bikes," I replied. The plan was soon settled, two old bikes were hired and we decided to leave early next morning. The cycles, however, started raising objections. The weather too seemed to give them a hand. One of the cycles got punctured, the other's wheel was not in a mood to rotate in a single plane. The sky was overcast heavily ; the drizzles became more rapid and heavy and an almost ice-cold wind started blowing.

"Come what may, we must start," I shouted at no one in particular, and we pulled the reluctant bikes towards the cycle-shop through mud and slime. Dragging, cleaning and mending delayed us by one hour. We left Rabwah at 8 a.m. As we passed Chiniot, the weather grew nicer and the drizzles stopped. Vali now was enjoying himself. "It is quite nice ; no exertion and exhaustion ! Why not proceed to Lahore via Lyallpur ? Instead of a ride, let it be an adventure," he said. I hailed the idea enthusiastically and shouted my satisfaction at him through the cold December breeze. We reached Lyallpur in two and a half hours.

We did not feel any fatigue and after a few hours rest, were soon on the way to Lahore, with nothing but two ancient and rickety bikes between our legs. Dusk fell and it soon became very dark. The stars disappeared behind the heavy clouds. The freezing wind was slowly developing into a gale. The chill, helped by our already wet clothes, travelled across our spines. It started raining almost in our faces. We could not maintain our speed and moved at a slow and watchful crawl for fear of falling into the inhospitable, deep and marshy ditches on either side of the narrow metalled road. We had no gloves and our hands were frozen stiff. Noses and ear tips were swollen and aching painfully. Our clothes were drenched and the bikes too were reluctant to move on due to the sticking mud. We pushed and pedalled through this impenetrable muddy darkness and reached Jaranwala at midnight after three hours' hard labour. Near Jaranwala, while I was leading, I heard a sound

resembling "Kh-r-r-r-Phuthh" from behind, followed by a yell that mingled with the moaning gale.

"O, Rashid ! Come back. I am licked." I went back and found poor Vali lying in mud with his bike on top of him. He had had a bad slip and was splashed all over with mud. This was a very sad accident. But finding Vali safe, I could not restrain my laughter. Vali is a good sport but just then he was not in a very humorous mood and gave me quite a bit of his mind. Anyhow, we managed to reach Jaranwala. By that time it was raining the proverbial 'cats and dogs.'

A few faint lights in the whole of the town and closed doors greeted us. Not a single hotel was open at that hour of the night. With great difficulty we managed to find shelter to pass the night. The next day, the 3rd of January, we started for Lahore and the weather being fine we reached there in the evening with no mentionable incident except that we were terribly tired. Our friends at Lahore were surprised to see us in our curious muddy attire and were amazed to know of our adventure. We slept like logs and got up at 10 the next morning. Our legs were still stiff and we were in no mood to return. Yet we started back on our hundred miles pedalling to Rabwah.

The journey back home was punctuated with a thrill here and a thrill there. At Sheikhupura we routed Samee out of his 'den' and gave him the shock of his life with our painted, muddy apparel. We undermined his morale considerably by relating our adventures at the top of our voices. We left him stunned and, before he could recover and find tongue to cross-examine us, we were on the road. The going was a dangerous and tricky business. Traffic was heavy and not unoften did we catch ourselves zig-zagging between the approaching and receding buses and trucks and carts. We, however, had to keep to the precarious safety of the road as the moment we touched the kacha ground along it we got stuck in the pulpy, slippery quagmire to which the overnight rains had reduced the immediate vicinity of the road. It was a game of hide-and-seek between us and the heavy vehicular traffic. And what a dangerous game it was ! It was providential that I escaped unhurt when a truck brushed me off my precarious perch on the bike with nothing but minor scratches to remind me of my escape.

We had our dinner at Sukheki, which was washed down with scalding hot tea. We relaxed on the rickety old chairs like lords and spread ourselves expansively. We could not, however, enjoy this luxury for long as the last lap of the journey was not a very easy proposition. To tell you the truth, we were tired. Pindi Bhattian was reached at about 10 p.m. We still had a good thirty miles to go. We were feeling stiff and sheer will or, if you please, bravado, kept us going.

(*Continued on page 23*)

Let Me Talk

by
M. Islam Bhatti

It is pointed out that all the mystics have observed periods of silence. The disciples of Pythagoras had to keep silence for a year, some say even three years. Socrates remained immersed in silent meditation for several hours at a time. The only prayer recommended in the gospels is silent prayer behind a closed door. In the ritual of Mithra the initiaties were enjoined to "lay thy right finger on thy mouth and say 'Silence !' three times. 'Silence' according to some 'is the symbol of God.'

But if we study all these so-called arguments one by one, they seem to be the dreams of a thinker. In actual life, men of action are generally cruel opportunists and many of them, certainly, are great talkers, who make up their minds by thinking out aloud. Carlyle who preached the gospel of silence in 37 octavo volumes was particularly unfortunate in quoting as an example " the strong silent Russians" for the Russians are the most inveterate talkers in the world.

The diplomats have, of course, learnt to be silent in about six languages, but they also know that language was given to us to conceal our thoughts. How then can they be against speaking? The proverbs of all nations agree in commending silence to all who do not wish to give themselves away. To those who are not confident of their knowledge, silence is always a better policy.

'Speech is silver, silence gold.' But don't we see that it is the small change we are often in need of while on the other hand gold is a pleasant thing to be kept under lock and key.

Circumstances sometimes deny us the relief of speech. 'Well, reverend,' I guess that is the most 'profane' silence I ever listened to," said an American to his minister, who had misused a drive and broken his favourite wooden club.

The ancients amused themselves with stories of the taciturnity of the Spartans, who never wasted a word. Mr. Coolidge, the ex-President of the United States, earned the same reputation. One Sunday morning, when he came back from church, someone asked him, "What was the sermon about, Mr. President?" "Drinking," said Mr. Coolidge. "And what line did the preacher take, Sir?" "Against," said the President.

But this taciturnity is also not liked always. Shakespeare was well aware of the poignant effect of the shortest possible answers, like "He has no children," in *Macbeth*. This shows that to be brief does not always pay.

Poor Marcus Aurelius, the Roman Emperor, writes 'to himself.' "Men seek out retreats for themselves, cottages in the country, lonely sea-shores and mountains. Thou, too, art disposed to hanker greatly after such things; and yet this is very stupid, for it is in thy power, whenever thou wilt to retire into thyself. No place is quieter than one's own soul."

It appears the man lived so much in the inner silence that he was not at all a good emperor.

Then we may let Goethe have the last word—in which there lies the decision. "A talent is formed in silence, but a character in the stream of the world." The stream of the world is full of talk and talkers. And someone, I hope, must be bold enough to inform my friends that, "we should not like, to live in the moon, where there is no sound.

Le silence eternal de ces espaces infinis m' effraie.

(*Continued from page 20*)

At a wayside village, an amusing episode took place. The village dogs, it seems, decided to give us a civic reception. The reception committee included all the major dogs of the *iluqa*. The address of welcome was full-throated and genuinely inspired, and was followed by a loud barking applause. Some of the more enthusiastic dogs even tried to have a personal acquaintance with us and chased us as far as their legs could carry. But as we were not in a very sociable mood and had no time left for fraternizing, we shook the dust of this reception off our feet as soon as we could. Needless to say that it was not without difficulty and embarrassment on either side that we could get rid of the reception committee. In the scuffle, we got one or two scratches for keeps. The rest of the journey was uneventful except for one interesting accident. At one stage the screw of my pedal got loose and I got down to adjust it in the dazzling lights of an approaching truck. I was standing in the middle of the road. I shouted at Vali, who was following me, to stop. He didn't hear my shouts nor could he locate my position on the road due to the blinding glare of the headlights of the truck and ran full tilt into my hind wheel with a bang and fell on the ground describing a complete somersault on his way down.

We reached Rabwah at midnight, tired and completely exhausted. After resting for one day, we went to Lyallpur and came back the same evening. The bikes are still lying with the local repair-shop and if anyone feels like underestimating our three hundred miles on pedals we invite him to have a look at the two ancient, gouty machines and then pass his judgment.

When I had Wings

By
Saeed Abdullah

This was an event and perhaps, one of the most important that I have experienced during the course of my life. It was on the 8th day of August, 1952 when a friend of mine invited me to the marriage ceremony of his brother. I was glad to accept the invitation of a friend who shared my happiness and sympathised in my sorrows. At exactly 8. a. m. I departed for his residence and stayed there for eight hours, passing the time in merriment. Completely exhausted, I reached home at 6 p. m. and immediately fell asleep. I felt that my father came in and, addressing me as his only son, said that I was to fly to Pakistan within a week, and that he was to escort me to a certain island. Words fail to express the joy that flashed through my mind. I awaited anxiously the glorious day when I would travel by aeroplane for the first time ; when I would see a foreign country and be a foreigner myself. But the crawling of the hours and the days was painfully slow. At last, the day did come and after a long prayer by relatives and well-wishers, my father and I waving fare wells slowly disappeared into the belly of a huge B. O. A. C. plane. No sooner did we take our seats than the door was closed behind us. Before I could finish my prayer for a safe arrival at our destination, I found that we were in a strange atmosphere.

We had hardly traversed a distance of 95 miles when the alarm was given that the 'plane was on fire. We hurriedly fixed our parachutes and before my father could get ready I jumped through the exit to a new world which looked like the next. My parachute, however, descended gradually down from an altitude of 10,560 ft. directly over the Red Sea. Above me and below me I could see nothing but the blue sky and the blue sea. At last I fell into the sea with a tremendous splash. I was, however, a good swimmer as I had mastered the art of swimming when I was a lad of twelve and had no difficulty in fighting the waves for an hour or so when a shark appeared before me. Its mouth was wide open and it was preparing to swallow me at one gulp. Seeing through its gullet, I decided that struggle was quite useless. I, therefore, immediately jumped forward and passed down to its belly. Luckily I had a table brush in my pocket which I vigorously rubbed against the intestines of the shark. It could no longer tolerate the severe pain and vomitted me out at once. I was thus set free in the vast ocean once more. A huge wave threw me against a rock and I yelled for help. I found myself clutching my bedsheet and discovered to my relief that it was just a DREAM.

Mr. Prodigal

by

Hamid Ahmad

Who is that, surrounded by so many ravenous faces, sitting in the middle of the Tuck-shop? He has made the servants run to and fro and disturbed their state of rest and peace. He is giving order after order. Now the servant is coming with two full plates of "halwa," now sweets, pastry and cream-rolls come flying. The tea set is already there. Let us go and have a look at his princely face. Ah! I see, he is Mr. Prodigal. It is the first of the month. His pocket is heavy and his purse full. Instead of facing Mohammad Ahmad and Abdul Sattar, he has decided to indulge in a spending spree at the Tuck-shop. Fee clerks can wait. Not that he does not want to pay his dues. Only it happens to be an off-day. So where is the harm in waiting? Moreover, the fat wad of currency notes imparts feelings of bliss and expansive calm which are almost heavenly in nature. 'No, I won't spend this money except where it ought to be spent. A sizable part of it must go to the coffers of the hostel. It might as well lie in trust with me,' he muses. Suddenly the itch comes, the itch to smoke. It had almost died out with the dwindling of cash. The cigarettes are, of course, not available. 'Can't I have a little private joke at myself in breaking my resolution not to overspend,' he says to himself. The Tuck-shop cook-house is already sending out sweet aromas of culinary skill. 'Samosas' are ordered. He must have something sweet too. 'That fellow in the corner thinks that I am a miser. The other one too near him.' Both are invited. Soon it develops into a general invitation. 'Let me have fun while it lasts'. The next day and the day after next? Who cares for the thin pocket. The poor remnants of the monthly budget cannot meet the exacting college and hostel bills anyway. This time and it is the last! Of course, mother will pay if father does not. He can always say the books cost too much due to devaluation of currency. This devaluation business has been very useful after all. Not a crude or commonplace excuse like 'buying the blotting paper' either. It is formidable and respectable. It is a double-edged weapon too. Besides getting you the much needed 'dough,' it proves your bonafides as a serious student of world finance. True, if dues are not paid in time, your name shall be gazetted as a defaulter. But so many students don't pay their dues in time. They don't, because they can't. 'Who knows whether I can or cannot.' Moreover, in case you are debarred from attending classes or told to leave the hostel and pack off to home sweet home, you do get a certain amount of publicity which might even be of some use

Contd. on pape 26

BEAUTY

by

Iftikhar Ahmad Shahab

Physical beauty is only skin deep. It is merely a veneer, a coat of paint, a whited sepulchre and a covering to conceal the inner vacuity and deformity. A beautiful countenance is generally considered guileless and innocent on account of the bright sheen that covers it up completely. It intrigues us with its enticing veil temporarily and then its effect is diminished. With the passage of time it is constrained by particular conditions to doff the artificial wrap and thus automatically renders us capable of penetrating deep into the detestable hollowness and emptiness that lurks under its alluring surface. Beauty can never be expected to acquire a position of permanent existence.

It exercises a certain impression upon our minds and then disappears into a dismal and dreary past.

The rosy petals of a flower captivate our cordial appreciation as we direct our glance at them. This spectacle of delicate perception immediately packs us off to the domain of imagination. We cannot help pouring down our lips a few complimentary words in consideration of the exquisiteness and subtlety of this extremely beautiful flower. It overwhelms our aesthetic faculty entirely and makes us plunge into a temporary reverie.

It is universally acknowledged that a human being is overwhelmingly impressed by the magic of beauty. He is spell-bound as it were. He is caught in the web of its charm, for beauty is like a hunter's net where every foolish bird is meshed in. But the potent and impetuous influence af beauty is soon abated, and finally fades away into nothingness. The fine-patterened flower withers away. Its sweet and appealing colour fades. Its tantalising influence ceases to exist. The very charm gets out of it. Its bloom is lost; its youth is rusted; the petals shrivel up and drop off. The flower, which a few moments before, was a picture of bewitching fascination and delicacy is now transformed into a state of destruction and is deprived of its individuality. All things are subject to termination and none, within the limitation of feasibility, can escape this end. The flower was proud of its charm. It swayed in the soft and gentle wind, imbued with a feeling of elation and arrogance. But where have gone its pride and presumption and overweening superciliousness? All is utter forgetfulness and oblivion. All its freshness has departed; its bloom is no more.

Incipiently its influence is dominant but the trouble is confined to the stubborn fact that it is thrust into the limbo of inexpressiveness before it has even risked a start. It is based upon sandy foundations and is liable to crumble down ultimately.

All material things are mortal. They live for a short time and then die. The beauty appertaining to them also comes to a similar end. It cannot claim an exceptional treatment. Beauty is not constant, stable and persistent. It is fickle and inconsistent. It is empty, blank and hollow from within.

The multi-coloured flowers may please us; the wavy, glossy, golden tresses of a willowy, pencil-slim form may invite our admiration; the sight of a chubby child may set our hearts beating more speedily than usual. But this sight is only 'passing strange.' Beauty cannot continue unchecked, and without interception. It becomes evanescent like electricity because it has not been sanctioned a permission for life-long existence. Beauty is succeeded by intolerable ugliness. It is followed by an abysmal and almost fathomless silence. It is replaced by tragedy and frustration. It is full of fluctuation and change, and it is packed with incongruities and contradictions.

Superficial beauty resembles a shadow. We should endeavour to evade from plunging into this wild goose chase, we should abstain from being attracted by its deceptive appearance.

We ought to be insistent upon the pursuit of spiritual beauty which will never suffer destruction, which will never part with us like a sincere friend, which is not treacherous and illusive. It is real and constant and consummate. It is sublime and profound. We must pursue eternal beauty which descends upon us in moments of communion with the Ideal. Real beauty is the spring of permanent contentment and satisfaction. It is not tottering and wavering; it gives us inner consolation and tranquillity; it soothes our minds; it freshens up our fagging souls; it heals our sores, blesses us with the joy of humility, it makes our existence an everlasting bliss. Immaterial beauty is the real beauty, for it does not change. It is as innocent as a new born baby. It emanates from pure virtue.

Superficial beauty, which all of us hanker after, is an optical mirage or a tricky coast line. It sneaks in from the front door and slinks away from the back one. It is like a bubble that bursts before it swells up to maturity. It is like vanishing cream that disappears as soon as we rub it into the skin.

(*Continued from page 24*)

if you seek election to some office. Examinations can be a terrible proposition no doubt. But one should never lose courage. Moreover, examinations are no test of ability. They are largely a case of luck. 'Luck! yes, that is the word.'

And this cycle goes on until one fine morning, Mr. Prodigal overspends himself. He has not only expended his purse, he has expended to the dregs his time, his energy, his self-respect and alas! his honour.

Later in life he might be found adorning the doors of a night club or if his luck turned and he reformed his ways, he might be seen earning his meagre pittance as a poor clerk in a private office.

Lilliputian Era in Perspective

by

Muneer-ud-Din Ahmad

Dwarfs are those who look like children but talk like adults. They watch, listen and move, quite as we do, except for their stature which is the only distinguishing trait that places them as a class apart.

Dwarfs are very useful individuals. They do their utmost (not by their own consent) specially to stabilise the economy of a country and generally help in every sphere of national life. Whether in education, military or in housing they can lessen our strain to a tremendous extent.

They require small clothes, tiny gloves and socks and shoes to put on. Extremely small books (of small size) to read, small chairs to sit on and small arms to protect them. Most of the thrill lies in their joy to live in small and well-furnished houses with dwarfish furniture and tiny household articles.

There is no justification that we, the members of the "taller species," should feel proud of our stature, big arms, clothes, houses and giant-sized furniture. On the other hand, the pigmies invite us to a thorough heart-searching and careful consideration of the national and international problems. They urge us to help solve those problems which face millions and millions of humans who are ill-clad, ill-fed and lying under the wide blue sky suffering the unimaginable tortures of heat and cold.

At this stage I would like to suggest a practical scheme for the universal benefit of mankind. I think a laboratory should be set up where scientists from over-populated countries should be invited to carry out a series of experiments to discover some means of reducing the height of individuals.

Three standard sizes of dwarfs could be produced:

1. *Normal dwarfs*:- According to a fixed standard they will be two and a half feet high and will have pithy bodies.

2. *Extraordinary dwarfs*: They will be about one foot shorter than the normal pigmies and will not necessarily possess strong and energetic bodies.

3. *Medium dwarfs*: Their height should vary from two and a half to one and a half feet. They will have thin bodies.

It is my personal opinion that if adequate attention is paid to reducing the stature of mankind, it will help lighten the pressure of the increasing demands of food, clothing, housing, etc., in the world. In fact, the smaller we are the less we consume. True, it is eugenics the other way round. But the problem

is pressing. There is no time left 'to stand and stare.' We should either increase supply or lessen demand immediately.

To start with we should lessen demand. Efforts are being made to increase supply, but the reduction of demand is not receiving popular attention, There is one brutal way to decrease demand. That is the atomic way. It aims at simply wiping out humanity. I do not suggest any such thing. I maintain that if we shrink in size—physical size of course—we lose nothing. Moral or mental greatness has nothing to do with physical size. Let us, therefore, concentrate on reduction of physical volume. Just think of the great implications of such a venture. It will mean increasing the existing accommodation in the world, particularly in the hostel at least by five hundred per cent.

Cubicles will become dormitories and dormitories could be used as halls. The buses that carry fifty shall be able to accommodate many more. For the time being, the drivers shall have to be of the orthodox size, as the present steering wheels will be too high for a pigmy to manipulate. Pens could be used as guns and ink-pots as water tanks. The taps of the bath-rooms shall have to be lowered but it will be a paying proposition as otherwise tall attendants shall have to be kept to help the new brand of humans. I beg your pardon. They are not exactly a new brand. There are many fortunate members of the future species who actually exist in the hostel today. Just now they suffer from an acute inferiority complex. They avoid going about in the company of the tall residents as their high stature sets their small size at a disadvantage. Unfortunately they cannot wear high-heeled shoes, but no amount of height gained through these artificial aids can make up for the gap between them and their taller brethren. In short this scheme is a useful scheme and could easily be called the 'New National Savings Scheme.' The Physical Education Department of the College is advised to anticipate events and set about taking real interest in its possibilities.

A society named, "Dwarfs League of the Rich and the Poor" could be formed.

It will thus be clear to all that pigmies are the most patriotic because they cut their expenses to the minimum and save their country much unnecessary expenditure. I am afraid that in the near future there will be left very little space for human beings to live, and so people will willingly agree and generously donate for the "Dwarfs League of the Rich and the Poor."

Thus in a short time we will see a Lilliputian era opening up before our eyes. Moreover, this era, along with the modern Atomic Age, could easily be the golden age which would bring happiness, prosperity, peace and tranqullity to the underfed people of the world.

It is no mere fantasy. The rate at which our physical health is deteriorating unmistakably shows the shape of things to come. My only hope and prayer is that if we deteriorate in size, we improve in quality.

Hard Work

How hard is your name !
How pretty is your fame !
When the result is going to be out
We are afraid there is no doubt
You make us leap and bound.
'Tis a circle within a circle, yet your sound
Lifts us in an ending happiness.

Still your name is dull distress
Because you interfere with our days
Spoil our evenings and nights.
And the rays
You shed are ugly in the beginning.

But when the outcome is declared
And the toil and joy compared
You look l'ke a fairy, golden and serene.

Since beginning to end you have always been
Our friend, our fortune and our love. And the wise
Now know you are a blessing in disguise.

Hameed Ahmad.

The Identical Twins

In form and feature, face and limb,
I grew so like my brother,
That folks got taking me for him,
And each for one another.
It puzzled all our kith and kin,
It marked an awful pitch.
For one of us was born a twin,
Yet not a soul knew which.
This fatal likeness even dogged
My footsteps when at school.
And I was always getting flogged
For John turned out a fool.

I put this question hopelessly,
To every one I knew—,
What would you do if you were me,
To prove that you were you.
Our close resemblance turned the tide
Of my domestic life ;
For somehow my instended bride
Became my brother's wife.
In short, year after year the same
Absurd mistakes went on ;
And when I died—the neighbours came
And buried brother John !

(H. S. H.)

Hope

Kibriya Ahmad Muazzam

"Strive, hope and fear not," said Browning. Despair is the most dangerous obstacle in the way of human progress. Desperation is recklessness but should be distinguished from hoplessness. Desperation may mean life, even hope. But hopelessness is cowardice, disintegration, death. It is the hopeless who commit suicide, a most disgraceful act for man and a very unworthy end. Those who are strong, self-reliant and have confidence in their future behave in a different manner. They bear hardships and face difficulties to make their lives happy. People who have hope and character, plan for the future. They conquer countries and found empires—political as well as spiritual and moral. They span the oceans and cross the impassable deserts.

When a man is sick of life and finds that there is nobody to help him, not even his relatives and close friends, then his only consolation is in one thing : the Angel of Hope that comes from God. He smiles upon him through the ever increasing darkness and comes to his rescue. He blesses him with new thoughts, new ideas and new desires, with the result that the man, who was devoid of all hope and aspirations, feels himself transformed at the divine touch of this magic rod. He gets ready to start again. It is a fact that "God helps those who help themselves." Success in the struggle for existence is the result of actions, but actions are the result of ideas and intentions. Ideas can only grow where there is hope. Hope thrives on belief in God and a life after death. Without this belief, life becomes a barren, dark and dead alley.

The noble example of the Prophet Mohammad (peace be upon him) is a case in point. He fought against the powers of darkness, alone and single-handed. Opposition and persecution could not shake him. He did not flinch against the unified might of friends and foes alike. Intimidation and bribes could not swerve him from the path he pronounced to be the only right path open to mankind. He never lost heart or patience. His hope and courage were founded on the bedrock of conviction in God. And he succeeded as the world knows. Even we can succeed to day in the face of similar odds if we believe in God, the fountainhead of all hope. In fact, the example of the Holy Prophet is a reminder to us, lesser men. He has blazed the path. It is for us to follow in his footsteps. Let us, therefore, be up and doing. Let us not pull long faces. Islam is a living force because the God of Islam is a living God. We are bound to succeed only if we try and never lose hope. Let us, therefore :

Cheer up, take heart and cease repining as behind the clouds is the sun still shining.

Are You A Cricket Fan

by

M.A. Cheema

Do you remember the names as well as the pedigrees of the famous cricketers? Can you recollect the year and the place when Hanif completed his first century? When did Maqsood marry? To which Church does Sir Len Hutton belong? Can you name the bowler who took the maximum number of wickets with the least number of overs when the Pakistani team played the first official Test against the M.C.C.? How many times was he cheered by the crowd? What can be the probable number of fans who shook hands with Fazal Mahmud after his excellent performance at the Oval? How many times did the English cricketers jeer at Idrees Beg and in what manner? What brand of whisky was he compelled to swallow when for once the British humour ran amuck? Have you seen all the famous cricket matches played in Pakistan without spending a penny from your pocket? Can you guess as to when Tony Lock will be out of action due to a sprained muscle? Can you calculate to the fourth place of decimal the velocity at which Khan hurls his deadly missiles? Also what is his own height in centimeters?

If you can answer all these questions correctly and promptly, you are entitled to be an ex-officio member of the cricket eleven. If you can answer only half of the questions mentioned above and although you have failed twice in the University examination, you have a chance of being included in the "A" team. If, however, luckily, you have failed six times, the right of your admission to the "A" team cannot be questioned.

Can you stand idle for an hour and then suddenly run like a maniac after an apparently invisible object? Can you walk with difficulty as if some heavy weights had been tied to your legs and run as if somebody had pushed you from behind? If you can, you are a crack cricketer. Have you ever met a man speaking English with the slang of a Tommy? If you have, you have probably met a skipper. Any lean, thin fellow with a sweater bearing "V" shaped stripes (often worn up till May), a projected cap, white trousers and high-heeled rubber-soled white shoes invariably is a member of the cricket eleven. If you have any doubts regarding his bonafides, you need only invite him to tea. If he accepts your invitation without hesitation you have actually discovered the future Captain, a veritable world beater, provided, of course, the tea is good and the bill is paid by the future hero.

My Best Friend

M.A. Shakir

The animal kingdom is a world apart. Though the laws of life govern men as well as animals yet there are very few men who have a friendly disposition towards the down-trodden animals and much less towards a camel. Fortunately, I have a soft corner for this much-despised, bulky and cumbersome animal. I have developed a deep sympathy for the camel, not because he is beautiful or useful but because I love him as he is the most profound animal in the whole world. I am a human being and every human being is essentially a thinking being. So a sort of community feeling between us two is quite inevitable. A close study of the camel's psychology and behaviour reveals very interesting facts.

To begin with, his deep-seated hatred for life is manifest from the fact that he does not like to see the light of the day for eleven months while he is in his mother's womb. Even when he is leading his normal life, he looks always dull and absent-minded as if this world were too low a place to engage his active interest. He is so calm and cool-headed that he does not lose his temper even under the worst incitement. It is here, under trying situations, that this thoughtful trait finds its manifestation. In a moment of extreme physical passion, he takes the shortest possible time for its gratification. His master rouses him from his slumberous poise after administering many severe strokes. With his leathery lips he does not eat all the varieties of grass in the desert. Certain plants are poisnous to him and certain others he leaves for the sheep as a goodwill gesture.

Our friend practises austerity in drinking as well. He can submit to protracted fasting but must drink once for every ten days in winter and once for every three days in summer. Then he needs a whole cistern, for he can swallow twenty gallons at a draught. His hump is a reservoir of energy and he stores fat in it. But the longer his journey, the more it diminishes in size. In bargaining for a camel the purchaser first looks at his hump and then his teeth. The former tells how much work he can do while the latter indicates his age.

The camel is subject to recurring calamities which he endures with a stoic patience. Every year he contracts the mange. He will die of it unless he is properly treated with a kind of vegetable tar. When wounded, he cannot be treated with antiseptic methods, for his wound infects the whole body.

I must admit that my friend is not particularly good-looking and has an abnoxious smell. Like all noble spirits, he utters loud vows, now and then, against the ugliness of

life and the stupidity of man. He continuously indulges in moans and groans, so human that they are heart-rending and can excite the sympathy of even a callous man. He asks himself, "What am I? Whither am I going? Why was I born? Why should this pigmy be my master?" In short, he is a note of inte-rogation by himself. But a shower of blows is all the reward for his search for truth. A philosopher and scientist is always applauded and elevated for his questioning but the fate of the camel is dealt out in another measure and yet men pride themselves at the delusion that they never let justice go down. If only men could realize the hollowness of their loud claims!

The camel acts upon the philosophic and saintly precept of 'plain living' and never deviates from this path even if he requires biologically to depart from simplicity. He dislikes elaborate food such as barley, oates, hay, etc. He prefers leafy twigs and the drier and the woodier they are, the better he relishes them. He is fond of "hoct," a ball-shaped shrub with a bitter taste, growing in the desert. He does not disdain leaves or prickly thorns. He picks them up all.

My friend is particularly an oriental animal. He cannot last long in stables. To keep fit, he needs the wide open spaces of the desert. The sun, wind and sands make him healthy and fit. Only the people of oriental lands are good camel-drivers and only they can understand how much work he can do. The camel likes his master and is indolent by temperament. He is capable occasionally of excessive and protracted exertion but he cannot do a fixed amount of work every day all the year round. For six months in the year he must graze in the pastures and remain absolutely idle.

Men have reduced my friend to the humble position of a beast of burden. The bedouins loathe him. They say that his heart is as black as tar and that he is as mischievous as the devil. However, they do not understand him.

The camel's fastest pace is the long trot, the pace of desperate flight. If the long trot is hard on the rider, it is because it is unnatural to him. It is so jerky, violent and irregular that the rider is obliged to compress his stomach tightly with a girdle in order to bear it.

A distinguished scientist, says Louis Sobol, who probably saw him, was observing the heavens through the huge telescope at the Mt. Wilson Observatory. Suddenly he announced, "It's going to rain." "What makes you think so?" asked his guide. "Because," said the astronomer, still peering through tee telescope, "my corns hurt."

A Personal Apology

by
Vali Ahmad Shah

An Arabic proverb declares that the taller a man the greater fool he is and the shorter a man the more mischievous he is.

None of us will like to be called a fool, but one can bear, to a fair degree, being called mischievous. This is practically proved when you call a first year student a fool. He will, however, peck at you like a chicken or go to some authority.

Being short statured is of great economic benefit. There was an Egyptian who was born to a poor family. When only sixteen years old, he grew too huge for his parents. They were fed up with him. They were unable to pay his food bills and the house was unable to accomodate him. They finally appealed to King Farooq who ordered a special bed for him in the Alexandaria Hospital.

There was another man Robert, in U.S.A., who required a 19" sized collar and ate two dozen eggs for his breakfast. His suit length was 8½ yds.

There was still another man named Peter, who had once a chance of crossing the Atlantic in a ship. He was so tall that the baffled captain of the ship had to knock a hole in the adjacent cabin so that Peter could sleep with his head in one berth and his feet in the next.

There is a man in England, who is an unproclaimed wonder of this world. He is so tall that he can't sit in an ordinary bus and can't walk confidently as he has very little control over his limbs. The special carriages he has made to meet his unique problems of locomotion, are so costly that they would easily cost a fortune to a normal Pakistani. He wears clothes enough to clothe a Japanese family ; he eats food which could otherwise suffice for a week. He had to have special allocation of clothing coupons during the last World War ! Not a very patriotic gesture by any means! His shoes cost £.20/- a pair. A rather costly affair !

These instances show how expensive it is to be a tall man. Besides, it makes the situation comic for efforts to hide tallness only excite laughter.

Many past heroes like Napoleon, Hitler and Rommel, etc., were short-statured. It is very rare that we find an instance when a tall man fails to attract the attention of the street urchins. Moreover, a short man is very active, he looks young and gay. He is quicker, smarter and has the better of his taller brother.

During the last World War some Japanese were digging a trench, when suddenly a batch of Americans ran into the post. The Americans

promptly threw a hand grenade at the Japanese. The bomb landed amidst the surprised Japs. One of the Japanese nearest to the bomb dived at it and threw it back at the Americans. It exploded right over their heads and the tables were completely turned. To be so accurate and quick-witted as to hurl back the bomb in nothing more than 4 seconds (the time a bomb takes to explode after the safety-pin is withdrawn) isn't a joke. It requires smartness and intelligence, which were the only factors to possibly save the Japanees from meeting their doom. Japanese are a short-statured people. Little wonder, therefore, if they are very very active.

Our hostel beds cause no end of trouble to tall people. They are made for normal students. A tall man has to shrink to the length of the bed so as to look like a capital S, or otherwise his extremes i.e. head, and feet, lie dangling as if he were a see-saw. He risks indigestion, insomnia and an aching neck.

I wonder if the tall people have any useful purpose to serve except when they are asked to fix a bulb or adjust a curtain. Not a very full time or dignified employment by any means. What cannot, however, be cured, must be endured. My sympathies, therefore go to my less fortunate friends who are too tall for an easy conscience.

(Sour Grapism, perhaps, or the pigmy's licence ! We do not, however, grudge the writer of this article a solid hour's escape from reality, during which he was employed in writing this interesting article. We hope some tall gentleman will take up the challenge and retaliate in kind. Ed.)

DIZZY Vs. GLADSTONE

Disraeli defined the difference between a misfortune and a calamity thus : "If Gladstone fell into the Thames, that would be a misfortune; if anybody pulled him out, that would be a calamity."

"Mr. Disraeli cannot possibly be sure of his facts," thundered Gladstone in one debate. "I only wish," was the reply, "that I could be as sure of anything as my opponent is of everything."

This is Somaliland

by

Saeed Abdullah

Enclosed by the prohibitive boundaries of Eritrea, Ethiopia, Kenya and the Red Sea, Somaliland has gained a place of importance on the map of Africa. Somaliland's struggle to win its freedom through words, slogans, blood, toil, tears and sweat was directly hit by political organisations and foreign domination, and the shackles of slavery were so violently fastened that the young generation of to-day has no way out and has to tolerate all sorts of injustices. The foreigners have ultimately, for their own good, divided the country into three governments, namely, the British, the French and the Italian Govts., in order to establish and strengthen their imperialistic hold against the internal and hostile forces set against them.

In my country, people are kept completely illiterate by our foreign masters. We do realise that so long as the source of virtue, whether individual or national, moral or intellectual, physical or mental, namely education, is obstructed, we will continue to be frustrated in our efforts to win freedom.

But the simple realization of this necessity cannot help the cause of education. Realization of this need and appropriate action at the same time are the sure way to the single product of success, solidarity, freedom and prosperity. We have been, therefore, on the alert all along to unite and not to yield, because wherever there is a will there is a way. Indeed, it is a blessing to be a self-deciding nation having a great future.

Due to extensive hills, dry valleys and jungles it has become an onerous task to have an adequate system of communication, the whole country being linked together by unmacadamised roads. The construction of railways is an almost impossible task. The country is blessed with heavy rains for six consecutive months, but lack of rivers has broken the back of the helpless nomads who are seen traversing hundreds of miles for days and days together in search of water. But for this prime factor, Somaliland would have been called "Little Kashmir" for fertility and scenery. Camels, sheep, goats and cows are found in millions. There are no buffaloes. To introduce this lovable animal in my country, will be something novel. My land is the land of nature where wild animals roam. They almost constitute the 4th Government—the Wild Somliland. Before I conclude I should like to remove one or two prevalent misconceptions. On one occasion, in the scorching hot days of June, I was sitting in a certain shop fanning mysef when a child entered and took his seat beside me. From the expression of his face I could see that he wanted to say something particular.

He asked, "By the way, when did you come from the sun ?" I told him that I *had* never been there. He continued saying that it was his father who told him that all Africans had visited the sun and it was due to this fact that they were black, and that he was wonderstruck to see me fan myself. Later on I met his father and requested him to explain the situation. He said that what he actually meant was that Africa was on the Equator.

I requested him to explain whether America was on the Equator or not and whether the Egyptians of Africa were black or grey. He answered that it was his father who had told him so and that he himself knew little about those places.

This is, however, the predominant superstition in the Indo-Pak sub-continent. For your information I may add that the maximum temperature ever recorded in Somaliland is 89.70 F. and that nature was wise enough to provide us with such thrilling colour of which we are proud. Another superstition found here is, that naked tribes and cannibalism still exist in the jungles of Africa. This is quite unfounded and fabulous. Kindly bear it through one ear and let it pass through the other. Of course we are hundred per cent Muslims there, 90% of whom are Sunnies. The combined population of all the three parts of Somaliland is 4,874,060, inhabiting an area of 3,31060 square miles.

The major languages are Somali and Arabic. They know very little about Pakistan. Ch. Mohammad Zafrullah Khan the redoubtable fighter for the freedom of Islamic countries, is, however, a household name and children are named after him. The attachment of my people to Islam and Muslims and Pakistan can be judged from the fact that when Qaid-i-Millat Liaqat Ali Khan was assassinated, the whole country went into mourning for three days.

In Bernard Newman's *The New Europe*, he tells the story of a professor at a cosmopolitan university who set his class to writing a thesis on the general subject of "The Elephant." The Englishman devoted his essay to "The Elephant and How to Hunt Him." The Frenchman considered "The Strange Love Life of the Elephant." The German entitled his tract "Are Elephants Aryan—and Can They Be Eaten? " The Russian produced "The Elephant— Does It Exist?" The Pole, whose piece was as long as all the others put together, wrote on "The Elephant and the Polish Question."

The College Round-up

The Convocation was held on the 17th of June in the College Hall. The solemn and dignified ceremony was conducted in an atmosphere of simple propriety and grace. The credit for this creditable performance goes to Mr. Naseer Ahmad Khan, the redoubtable convener of the convocation Committee. The most welcome feature of the junction was the brisk round of cold drinks that slowly developed into a regular merry-go-round.

The College Hall.

Our great hall is almost ready. It is a vast and commodious structure, enough to accomodate about 1500 to 2,000 people. The hall, like the rest of the building is a symbol of solidity, efficiency and grace and has been built through the personal effort and interest of Hazrat Sahibzada Mirza Nasir Ahmad, the Principal. The huge building is a monument of the labour of love put in by him over a number of years.

College Union :

The union held its Urdu declamation contest on the eve of Convocation. Messrs Hafiz Omar, Munawar Ahmad and Ata-ul Karim stood first, second and third respectively.

Professors Akhwand M. Abdul Qadir, Soofi Basharatur Rehman and Choudhri Muhammad Ali addressed the union on the importance of the English language to the students, vis-a-vis the University and the competitive examinations. Maulana Abul Ata spoke on Baha-ism.

Staff :

Mr. S. M. Shahid goes on two years' study leave for his Ph. D. He will he conducting his research at the Birmingham University. We wish him luck and laurels, free passage and plain sailing. The arrival of Mirza Khurshid Ahmad and Ch. Naseer Ahmad (both old boy) has considerably strengthened the English and Biology departments. Kunwar Idris, another distinguished old boy, is expected to join after the vacation.

Fazal-i-Umar Hostel :

The following changes were made in the cabinet.

Prefects :
Messrs Muneer-ud-din Ahmad
Ata-ur-Rehman.

President Union :
Ch. Bashir Ahmad

Secretary :
Ch. Javaed Ahmad.

Secretary Common Room :
Mr. Saeed Abdullah.

President Mess Committee :
Mr. Muneer-ud-din Ahmad.

Secretary :
Mr. Muneer Ahmad Khan.

The union arranged an outdoor function at Burj. Professors Basharatur Rehman, Muhammad Ali, Habibullah Khan, Naseer Ahmad Khan, Zafar Ahmad and Mubarak Ahmad also participated besides a number of non-resident and all the resident students. The Hostel admissions are going on apace and the rooms and corridors which looked deserted before are wearing a look of busy activity and the endless hum of our bath-room singers continues to silence the howling winds of June into reluctant breeze under the shower baths.

Science Society :

Patrons : Professors Mian Ataur Rehman and S. M. Shahid.

President : M. A. Cheema.

The annual function of the Society was a great success. The Head of the Science Faculty, Government, College, Lyallpur delivered an interesting and most revealing lecture on 'Atomic Energy'. Prof. Naseer Ahmad Khan read a paper on his impressions of the Science Congress at Dacca.

Kabaddi :

President : Mr. Mahfoozur Rehman.

Captain : Muhammad Sadeeq.

Secretary : Basheer Ahmad Cheema.

Our team did a wonderful job of work by defeating the F. C. College, Lahore and Government College Mianwali in the University tournament. We were, however, defeated by the Champions of the tournament Let us hope to do better next time.

Volley Ball :

President : Mr. Mahfoozur Rehman.

Captain : Ch. Basheer Ahmad.

Secretary : Shah Muhammad Faizi.

The team defeated a number of Colleges in a row in the University Tournament. We, however, lost to the best team in the University. Better luck next time !

The Hiking and Mountaineering Club.

President : Prof. Ch. Muhammad Ali.

Vice-President : Ataur Rehman Paracha.

Secretary : Abdul Mannan.

Brisk preparations are being made for the proposed trip to Swat. The club's affiliation to All-Pakistan Youth Hostels Association has been sanctioned.

The Proctorial System :

The Proctorial system has been enforced in the College with effect from the first of May, 1956. Prof. Basharatur Rehman M.A., shall be the Chief Proctor, Prof. Hameedullah Khan will be the Proctor. They will be assisted by the Proctorial monitors whose names are given below :

Raja Muhammad Aslam, Ataur Rehman, Muneeruddin Ahmad, Muhammad Akram, Shah Muhammad Faizi, Muhammad Sultan Akbar—*IV Year.*

Rashid Ahmad, Muhammad Afzal, Ayyaz Mahmood, Ghulam Muhammad and Muneer Ahmad Khan—*II Year.*

The system has been introduced with effect from, first of May, 1956 to supervise on an organised scale the activities of the College students outside the premises of the College, particularly after the College hours. The students will be expected to carry their identity cards, wear the College insignia and/or the College uniform and should in addition carry the written permission of their guardians if they go out during the prohibited hours. A strict watch will be kept over the behaviour of the students at public and other places of interest. The Chief Proctor and his staff will see that the students do not smoke, clap, go to cinema houses and visit places which have been declared out of bounds. An effort will be made to inculcate among them regard for decent behaviour and Islamic etiquette and decorum in general and congregational prayers in particular. Students will be allowed to go out only during fixed hours. Occasional inspection of the residences of the day scholars will be carried out by the Chief Proctor. He will also send regular reports to the Principal and recommend appropriate action.

The village idiot bought a book describing inexpensive fabricated houses and became so fascinated with the subject that he drew his last penny out of the bank and ordered a house by mail. Some weeks later he wrote a bitter note of protest to the manufacturer: that his house was a complete failure. An inspector came to investigate, and roared, "You loony, you've put up the whole thing upside down." "Oh, that's the trouble, is it?" pondered the befuddled customer. "No wonder I kept falling off the porch!"